(ناول)
کلاس فور کی محبوبہ
ممتاز بخاری
سندھی سے ترجمہ سمیع کندھر

کلاس فور کی محبوبہ

مصنف: ممتاز بخاری

مترجم: سمیع کندھر

Naveed Square. Urdu Bazar. Karachi
Ph # 021-32762483
E-mail: citybookurdubazaar@gmail.com
City Book Point

باذوق لوگوں کے لیے خوب صورت معیاری کتاب

بیاد

HASSAN DEEN

ادارہ City Book Point کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ ہمارے ادارے کے پیش نظر صرف تحقیقی کتب کی اشاعت ہے۔

کتاب : کلاس فور کی محبوبہ

مصنف : ممتاز بخاری

مترجم : سمیع کندھر

سندھی مترجم : سمیع کندھر

تعداد : 500

سن اشاعت : 2022ء

قیمت : 500 روپے

پیش لفظ

جب تک میں نے کہانی کے آٹھ صفحات نہیں لکھ لیے تھے، اس وقت تک میرا ناول لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرا تو اس موضوع پر تب تک کہانی لکھنے کا بھی ارادہ نہیں تھا، جب تک میں نے کالم کی آٹھ سطریں لکھی تھیں، لیکن اس سے بھی قبل میں اس کردار کا پروفائل لکھنے کی تیاری کر چکا تھا، لیکن لکھتے لکھتے ناول لکھ بیٹھا ہوں۔ جب ناول لکھنے کا خیال آیا تو میں نے اس کی تیکنک بھی وہی رکھی، جو میں نے اپنے بدلتے ہوئے خیالات کی بیان کی ہے۔

شاید یہ ۲۰۰۰ء یا ۲۰۰۱ء کا سال تھا کہ میں روہڑی شہر کے پہاڑی سلسلے کی طرف گیا ہوا تھا جہاں حروں کے لئے "باڑ" (جیل) بنی ہوئی تھی۔ وہ جیل ۱۹۴۹ء میں بنائی گئی تھی کیونکہ اس وقت تک حر ایکٹ ختم نہیں ہوا تھا اور سرکار کا حروں کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ تھا، انگریزوں نے اس کا نام 'حر کیمپ' رکھا تھا جس کو مقامی طور پر 'لوڑھا' کہا جاتا تھا۔ انہیں (حروں کو) قید کرنے کے لئے ایسی باڑیں لگائی گئیں تھیں۔ جو صرف کہنے کی حد تک باڑ تھی لیکن باہر سے اس کی اونچی اور مضبوط دیواریں بتا رہی تھیں کہ وہ ایک مضبوط جیل ہے۔ جس کا ایک ہی دروازہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی عجیب ماحول کا احساس ہوا، مجھے لگا کہ میں انیسویں صدی کی آخر اور بیسویں صدی کی چوکھٹ پر آکر کھڑا ہو گیا ہوں۔ کچی دیواروں کے اندر بغیر چھت کے ترتیب وار کال کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی ترتیب بالکل ہموار تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کی چھتیں اتار کر لے گیا ہے۔ مٹی کی دیواریں ایسی نظر آتی تھیں جیسے سینکڑوں بوڑھی عورتیں ریزہ ریزہ ہو

کر جھر جھرا گئی ہوں۔ تھکان دور کرنے کے لئے جب میں دیوار کے سائے میں بیٹھا تو میرے کانوں میں، ساتھ آئے ہوئے ستار زنگیجو کی آواز گونجی، "صاحب، لوگ ایسے استاد ہیں کہ مادھوری کو یہاں بھی لے آتے ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ستار میرے برابر میں بیٹھا ہوا تھا لیکن میرے خیالات مجھے تین سال پیچھے لوکو شیڈ میں لے گئے جب میں روزانہ 'سندھ' اخبار کے لئے، اُس کا پروفائل کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس وقت تک، میں نے اس کے بارے میں بہت سارے قصے سن رکھے تھے۔ میں روڈ پر کھڑا تھا، وہ سرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے کھوکھے پر بیٹھی تھی۔ دور سے لگتا تھا جیسے کوئی دلہن بیٹھی ہو۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا جو اس کا بیٹا تھا، وہ اپنے ننھے منے بیٹے کے ساتھ مستیاں کر رہی تھی اور دو چھچھورے آدمی اس کے ساتھ مستیاں کر رہے تھے۔ وہ ان سے اچھی طرح نمٹنا جانتی تھی اس لئے وہ دونوں وہاں سے کھسک گئے۔ میرے ساتھ آئے ہوئے ایک شخص نے جب اس سے کہا کہ میں اس کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں تو وہ ہنستی ہنستی اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر قریب میں اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ میں حیرت سے دیکھتا رہا کہ اس کے بارے میں نے جو داستان سنی ہے، وہ تو اس کے آگے معمولی سی بات لگتی ہے۔ میرا انٹرویو وہیں رہ گیا اور میں سکھر واپس آگیا۔

کچھ عرصہ بعد جب میں نے ۱۹۹۹ء میں کاوش اخبار جوائن کیا تو مختلف کہانیوں کی تلاش میں بھنوروں کی طرح کانوں پر بھی 'بھوں بھوں' کیا کرتا تھا۔ اس لئے کاوش اخبار میں کام کرنے کے اگلے سال یوں ہی باتوں باتوں میں لوکو شیڈ میں رہنے والے دوست ستار زنگیجو نے حروں کی اس باڑ کا ذکر کیا تو میں نے تیسرا دن ہونے کا انتظار بھی نہ کیا۔ اگلے دن میں اور وہ، کاوش کے فوٹو گرافر کے ساتھ پتھریلے علاقے میں بنے ہوئے اس قید خانے میں موجود تھے۔ وہاں ستار کے ذکر کرنے پر، مادھوری کا پروفائل لکھنے کا خیال ایک بار پھر سے اُمڈ آیا۔ لیکن اس کے بعد مزید دو تین سال گذر گئے، لیکن لکھا نہیں۔ مادھوری کے متعلق روہڑی کے دوسرے دوستوں سے بھی سنتا رہا اور

ذکر کرنے والوں کو اس کا پروفائل لکھنے کی خواہش کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن وہ اسی نام سے مشہور تھی۔ پھر جب سندھی سیٹلائٹ چینل کے ٹی این کا کام شروع ہوا تو میں لوکوشیڈ میں انگریزوں کے دور کے بنے ہوئے ناچ گھر کی اسٹوری کرنے کے لئے پہنچا تو مجھے ایک خاتون نظر آئی، جس کی صورت پہلے دیکھی ہوئی لگی، معلوم ہوا کہ وقت کی شدید ترین بے رحمی کا شکار یہ عورت مادھوری ہے۔ مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ کے ٹی این کے لئے اس کا پروفائل کروں، لیکن یہ بھی نہ ہوسکا۔ پروفائل کے لئے نہ کاغذ پر الفاظ آسکے اور نہ وہ کیمرے کے ٹیپ پر۔۔۔

لیکن یہ کہانی صرف اس مادھوری کی نہ تھی، نوابشاہ کی ریلوے کالونی میں بھی ایسے ہی المیوں اور حالات کو جھیلنے والی ایک خاتون کے قصے سنے، نہ صرف یہ بلکہ حیدرآباد میں بھی ایسے کچھ دیگر کرداروں کا ذکر بھی سنا جن کے المیوں کا رنگ یہی تھا، جن کے درد ایک دوسرے سے زیادہ تھے، جیسے گھونکی، جیکب آباد اور میرپورماتھیلو کی کچھ مادھوریوں کے صرف نام الگ تھے لیکن کہانی ایک ہی تھی۔ شاید صرف شکلیں مختلف ہوں گی۔

کچھ سال مزید گذر گئے۔ ۲۰۱۲ء میں شاعر دوست حبیب ساجد سے ملنے لوکوشیڈ جانا ہوا۔ حبیب ساجد ریلوے میں ملازمت کرتا ہے۔ ان دنوں وہ ریلوے گارڈز کے ہاسٹل میں رہتا تھا، وہاں پھر باتوں باتوں میں ذکر ہوا تو میں نے پکا ارادہ کیا کہ اب اخبار کے لئے ہر حال میں کالم یا پروفائل لکھوں گا۔ حبیب کے ساتھ اس سلسلے میں مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ یہ کردار تو ڈسکس کیا ہے لیکن اسی نوعیت کے دیگر کردار بھی تو ہیں؟ اکتوبر ۲۰۱۲ء کی شام آفس میں کاغذ لے کر کالم لکھنے بیٹھا۔ ذہن میں اسی نوعیت کے کرداروں کی ایک قطار لگ گئی اور میرا قلم رک گیا۔ میں نے وہ کاغذ پھاڑ دیا۔ دوسرے دن سیدھا پروفائل لکھنے کا ارادہ کر کے بیٹھا۔ شاید آٹھ سطریں لکھی تھیں کہ قلم رک گیا۔ وہ سطریں دوبارہ پڑھی، "یہ تو کہانی لکھ رہا ہوں"۔ میں نے مزید لکھنا چھوڑ دیا۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور کہانی لکھنا شروع کی۔ نیو شارٹ

اسٹوری کے نام سے فائل بنائی، لکھنے کی اسپیڈ تیز نہ تھی لیکن پہلے دن کمپیوٹر کے دو صفحات لکھے۔ اور ان کو بار بار پڑھا،۔ محسوس ہوا کہ کہانی مختصر نہیں ہوگی۔ اگلے دو دنوں میں لیپ ٹاپ پر آٹھ صفحات لکھ لیے تو مجھے محسوس ہوا کہ قصہ بڑھ گیا ہے، شاید یہ طویل کہانی ہوگی۔ میں نے سوچا خیر ہے، طویل ہوتی ہے تو ہونے دو۔ کیونکہ دنیا میں لانگ اسٹوریز بھی لکھی جاتی ہیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اب اسی نوعیت کے کئی کردار ذہن میں آچکے تھے اس لئے کہانی کی شروعات مادھوری والے قصے سے ہوئی ہی نہیں۔ میں نے سوچا کچھ صفحے حبیب ساجد کو بھیجتا ہوں کیونکہ ریلوے کے حوالے سے الفاظ کا غلط استعمال نہ کیا ہو۔ میں نے اسے ای میل بھیجی، پھر فون بھی کیا۔ میں نے کہانی آٹھ صفحات پر چھوڑ دی تھی اور مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے دھاگے کا سرا ابھی مشکل سے پکڑ میں آیا ہو۔ حبیب کے جواب کے انتظار میں تھا کہ ایک دن قدیر انصاری آیا تو میں نے اسے کہانی کا ڈیڑھ صفحہ ہی سنایا تھا کہ اس نے بیچ میں روک کر کہا، "یہ تو ناول ہو سکتا ہے۔"

اتفاق کی بات یہ کہ حبیب کا بھی فون آگیا اور اس نے بھی یہی بات کی کہ یہ ناول ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں اس نے دو تین الفاظ کی درستگی کی جو ریلوے کے حوالے سے درست بیاں نہیں کیے گئے تھے۔ میں نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا۔ کہانی لکھنا شروع کی تو مجھے احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ میں نے اچانک کہانی دوبارہ شروع سے پڑھنا شروع کی۔ اس کے ڈکشن میں تبدیلی کی۔ لیپ ٹاپ کو ایک جانب رکھا۔ آٹھ صفحات فائل میں محفوظ کیے اور فائل کا نام بدل کر ناول لکھا۔ مجھے خیال آیا کہ میری ٹائپنگ کی رفتار، میرے خیالوں کا ساتھ نہ دے پائے گی اس لئے ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۲ء سے رجسٹر میں ناول لکھنا شروع کیا۔ شدید سردی کے دن اور راتیں آئیں تو بارش کی بوندوں کا موسم بھی آیا، شاید میں نے لکھنے کا وہ عمل مختلف دنوں کے تقریبا ہر لمحے میں کیا۔ جب ناول کا آخری لفظ لکھ کر لمبی سانس لے کر ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولیں اور گھڑی کی جانب دیکھا تو اس نے مسکرا کر بتایا کہ صبح کے چار بج کر چھبیس منٹ ہوئے ہیں اور تاریخ ۳ جنوری ۲۰۱۳ء ہو چکی تھی۔

نوجوان حیدر علی میرانی ناول کمپوز کر کے فائل ای میل کرتا تھا اور میں نے لیپ ٹاپ پر اس کی ایڈیٹنگ اور پروف ریڈنگ بھی خود شروع کر دی۔ ایڈیٹنگ کے دوراں ناول میں کئی اضافے بھی ہوئے اور بہتری یا تبدیلیاں بھی کیں۔ اس دوراں حبیب ساجد سے ریلوے کے حوالے سے، خاص طور پر کلاس / گریڈ اور نوکری کے قواعد کے متعلق معلومات بھی حاصل کیں اور مختلف اوقات میں روہڑی ریلوے اسٹیشن اور لوکو شیڈ کے چکر بھی کاٹے۔ ناول میں اضافہ اور بہتری کے بعد رجسٹر میں موجود تحریر میں بہت فرق آگیا ہے۔ یہ کام بھی ۴ فروری ۲۰۱۳ء کو رات نو بج کر چھ منٹ پر مکمل ہوا۔ میں نے خود کو ایسے ہلکا محسوس کیا جیسے کسی کپڑے کو نچوڑنے اور ہوا میں لہرانے کے بعد سردیوں کی دھوپ میں سوکھنے کے لئے تار پر ڈالنے کی بجائے چارپائی پر بچھا دیا گیا ہو۔ ناول کی تیکنک کو اس کا موضوع خود صورت دیتا رہا۔ کردار خود بخود آتے رہے۔ میرے لئے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ شبو وہ مادھوری نہیں جو دراصل اس ناول کے لکھنے کی وجہ بنی۔ اس شبو کو تلاش کرنا آساں نہیں لیکن محسوس ایسا ہو گا کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ میں نے ہمیشہ 'موجود' پر زیادہ اعتبار کیا ہے، اور میں نے یہ 'موجود' ہمیشہ 'لاموجود' میں تلاش کیا ہے۔ تنقید کے باوجود اپنے مخصوص اندازِ تحریر سے انحراف نہیں کیا اور نہ ہی اس بات سے باز آیا کہ عام بول چال کے الفاظ اور لہجوں کو ادب کا حصہ نہ بنایا جائے۔ آج یہ الفاظ اور لہجے اجنبی کہلائے جائیں گے لیکن کل یہ ہی ادب کا حصہ ہوں گے۔ ادب میں اپنا لہجہ، الفاظ کا اضافہ کرنا اور نئے الفاظ بنانا تخلیق کا کارنامہ ہوتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک کام بھی کر گیا تو بھی مجھے اطمینان ہو گا کہ میں نے کوشش کی۔

میں لفظوں کی گولہ باری سے نہ پہلے کبھی مایوس ہوا ہوں نہ اب ہوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا خیال کبھی جمود کا شکار نہیں ہوا۔۔ کسی کی اچھی باتیں اگر کبھی ناگوار بھی گذری ہیں تو آگے چل کر ان ہی باتوں نے رہنمائی بھی کی ہے۔۔ ناول کے کردار ناول میں خود بخود داخل ہوتے گئے اور میں انہیں خوش آمدید کہتا گیا۔ مادھوری والے قصے کو ایک طرف رکھا، کیونکہ ناول کا جو پلاٹ بنا،

اس میں لو کو شیڈ میں رہنے والی بچے کی ماں مادھوری والا کردار بہت دور چلا گیا تھا، لیکن لو کو شیڈ اور روہڑی اسٹیشن کی لوکیشنز میرے دماغ میں چپک گئیں تھیں اور میں نے ان سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اپنے سارے کرداروں کو اس چھوٹی سی دنیا میں بلا لیا، انہوں نے بھے وہاں آکر خود کو سمو دیا۔ شبانہ سے شبنم، شبنم سے شبو اور شبو سے شبانہ ہونے والا یہ کردار اپنے اندر ایسے کئی کردار رکھتا ہے جو سندھ تو کیا پوری دنیا میں بکھرے پڑے ہیں۔ شبو سے منسلک کردار بھی اس ہی طرح ہر جگہ موجود ہیں۔ دنیا کتنی بھی بدلتی رہے لیکن احساسات اور کیفیتوں کے رنگ کبھی بھی نہیں بدلتے، اور ان سے اربوں انساں رنگتے رہے ہیں۔ میں نے ناول لکھ کر مکمل کیا تو اس کا پین سے لکھا گیا حصہ عبدالرحیم میرانی نے کمپوز کرتے پڑھا لیکن میرے بعد مکمل ناول پڑھنے والا پہلا شخص مشتاق ٹانوری تھا جس نے پروف چیک کئے۔

ممتاز بخاری

سکھر

10-02-2013

mumtazbukhari@hotmail.com

اردو ترجمے کے لیے

مجھے کافی دوستوں نے کہا کہ ناول 'کلاس فور کی محبوبہ' کا اردو میں ترجمہ ہونا چاہیئے، بات تو اچھی تھی لیکن یہ کام کون سرانجام دے۔ پھر یوں ہوا کہ میرے دوست سمیع کندھر نوکری کے سلسے میں سکھر آیا۔ باتوں باتوں میں اُس نے بھی ترجمے کی بات چھیڑ دی، میں نے بھی اسے ہاں کہہ دی۔ یوں اس نے جلد ہی یہ کام کر دکھایا۔ پھر میری نصرت زھرا صاحبہ سے ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بات ہوئی اور انہوں حامی بھر لی۔ انہوں نے ایڈیٹنگ پر خوب کام کیا۔ میں نے نظر ثانی کے لیئے ایڈیٹیڈ ناول کا اسکرپٹ اپنے دوست نیلفہ ندیم کو ای میل کیا، جنہوں نے عرق ریزی کے ساتھ ناول پہ کام کیا۔ میں ان تمام دوستوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے قیمتی وقت نکالا۔ مظہر السلام صاحب کا بھی شکریہ جنہوں نے میری گذارش نہیں ٹالی اور ناول پر اپنی رائے دی۔

سکھر

۱۴ اکتوبر ۲۰۲۱ع

جیسے ہی ٹرین کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی، اس کا جسم پٹری کی طرح سیدھا ہو گیا اور وہ کسی بھاری وزن تلے آنے کے لئے تیزی سے ایک ایسے کمرے سے نکلی، جو سسکیوں اور آہوں سے ایسے بھرا ہوا تھا جیسے بھوسے سے لدی مال گاڑی کی کوئی بوگی سالوں سے اسٹیشن کے یارڈ میں لاوارث کھڑی ہو۔ اس کا ایک کمرے والا کوارٹر، ریل کی پٹری سے اگر نیچے کی طرف اتریں تو زیادہ سے زیادہ ساٹھ سانسیں لینے کے فاصلے پر ہو گا۔ کوارٹر کے باہر گلی تھی جو بارہ فٹ کشادہ رہی ہو گی، جس کا بیشتر حصہ ان جھاڑیوں نے گھیر رکھا تھا جو گلی اور پٹری کے بیچ میں پردے کا کام کر رہی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں جگہ جگہ پگڈنڈیاں بن گئی تھیں۔ جہاں ان پگڈنڈیوں سے پٹری تک جانے کی سہولت تھی تو وہاں سے اسٹیشن بھی زیادہ دور نہ تھا۔

وہ، ریلوے کوارٹر سے نکلنے کے بعد اس پگڈنڈی سے اپنے دروازے کے سامنے والی اس پٹری کی طرف نہیں گئی، جہاں سے اکثر گریڈ فور کے گینگ مین اور کانٹے والے اس کے لئے آنکھوں ہی آنکھوں میں سندیسے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی تو پڑوس کے گبرو بھی دھڑکتے دلوں کے ساتھ کھڑے ہوتے تھے۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس کو لے کر آخری جھگڑا کب ہوا تھا۔ وہ دوسرے راستے سے پٹری کی جانب چلنے لگی۔ پٹری کے پاس پہنچنے کے بعد اس کی نگاہیں ڈوبتے سورج کی طرف اس پر جم گئیں، جہاں سے ٹرین کو آنا تھا۔ اس نے پٹری کی سطح پر ڈوبتے سورج کی کرنیں دیکھیں جو اسے ایسے صاف اور چمکتی محسوس ہوئیں جیسے اس کی

مرحومہ ماں ذکیہ کا چہرہ، جسے اس نے گھور اندھیرے میں بھی ہمیشہ روشن دیکھا تھا۔ پٹریوں کے درمیاں پتھروں اور لکڑی کے سلیپروں پر تیل گرا ہوا تھا اور ان پر چمٹی ہوئی سیاہی کی تہہ اکثر اسے اپنے باپ اور شوہر کی یاد دلاتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھوں کو ایسا عادی بنالیا تھا جو ٹرین کی بوگیوں کی طرح بھول کر بھی پٹری سے نیچے نہیں اترتیں تھیں۔ اگر اتر بھی جائیں تو اسے اپنے کانوں میں مال گاڑی کے گرنے جیسی ان گنت آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ نقصان کا ازالہ کرنے کے لئے تین سے زیادہ چرس سے بھرے سگریٹ ایسے پھونک دیتی تھی جیسے کوئلے پر چلنے والا انجن چل رہا ہو، اس کے ساتھ وہ آدھی لیٹر شراب بغیر پانی ملائے پی جاتی تھی جبکہ عام شرابی اسی بوتل کے چھ پیگ بنا کر پیتے تھے۔۔ وہ پٹریوں کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی کہ یہیں ٹرین گذرنے کا انتظار کرے یا اسٹیشن کی جانب چلی جائے۔ بیالیس تینتالیس برس کی عمر میں سے گذشتہ انیس بیس برس سے اس کی تین چار ہزار شامیں ٹرین کی پٹری کے پاس گذری تھیں۔ بڑی مدت کے بعد وہ وہاں رکنے کے بجائے اسٹیشن پر جانے کا سوچ رہی تھی۔ اسے پٹریوں کے پاس رکنا اس لئے پسند تھا کہ ریل گذرنے کی آواز کو وہ اپنے بدن کے شور کی طرح محسوس کرتی تھی۔

☆☆☆

وہ بھی دن تھے کہ جب وہ اپنے کوارٹر سے باہر آتی تھی تو اس کے ساتھ والے کوارٹروں کے دروازوں سے ہاتھ ایسے باہر آتے تھے جیسے وہ ان دیکھے کبوتروں کو دانہ ڈالنے کے لئے ایک دم سے آگے بڑھے ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر بھی ایسی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی جس سے محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنی قدر و قیمت اچھی طرح معلوم تھی۔ ریلوے کالونی کے نوجوان دکانداروں کی نظریں بار بار اس کے کوارٹر کے دروازے کی طرف اٹھ جایا کرتی تھیں۔ وہ اچھے خاصوں کو با آسانی اپنا اسیر بنا سکتی تھی لیکن اس نے کبھی ایسا کیا یا نہیں، یہ بات تو شاید خود اسے بھی کبھی معلوم نہ ہو سکی۔

پندرہ یا بیس برس پہلے، جب جوانی کی گھنگھور گھٹائیں ابھی اس کے جوبن کے آسماں پر براجماں تھیں اور اس کے حسن کی بجلیاں یکایک نوجوانوں کے دلوں پر گرا کرتی تھیں۔ ان ہی دنوں، جتنی خوبصورت وہ اپنی سہیلی کی سالگرہ میں جانے کے لئے ہار سنگھار کے بعد لگ رہی تھی اتنی خوبصورت توشاید وہ اپنی شادی کے موقع پر بھی نہیں لگ رہی تھی۔۔اس دن وہ کبوتر کی طرح پھڑ پھڑاتی، جیسے ہی گھر کے دروازے سے نکلی، تو اڑوس پڑوس کے گبروؤں نے اپنی آنکھیں دانہ بنادی تھیں۔ سینکڑوں تعریفی اور رشک آمیز جملوں کے میلے سے نکل کر اس نے اپنی سہیلی کے گھر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بنا ہی اسے یقین تھا کہ کون کون اس کے پیچھے آس لگائے آ رہا تھا کہ وہ مسکرا کر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ چلی جائے گی اور اسے ان کے مایوس چہروں کے تاثرات بھی معلوم تھے۔ بس اسے خبر نہ تھی تو صرف اس آنے والے لمحے کی جس کو اس کی زندگی کا روگ بننا تھا۔

اس کی سہیلی کا بھائی سلیمان سارے فنکشن کے دوران اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید وہ سلیمان کو اچھی لگ رہی ہے، لیکن وہ تو ایسا شکاری تھا جو دوسروں کے لئے شکار کرتا تھا۔ جس گھر میں سالگرہ کا فنکشن تھا وہ اسی کالونی میں تو تھا لیکن مین روڈ کے قریب تھا۔ دو کمروں والے اس کوارٹر میں اس کی سہیلی سنبل، اس کے دو بھائی سلیمان، عرفان اور ان کے والدین رہتے تھے۔ سلیمان اسٹیشن پر قلی تھا۔ عرفان کی عمر ابھی بارہ سال تھی۔ ان کا باپ رحمت ریلوے میں کلاس فور کا ملازم تھا اور اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں چپڑاسی تھا۔ سلیمان کو اڑتالیس برس کا اسٹیشن ماسٹر سعید احمد بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس راز کی خبر رحمت کو بہت دیر بعد ہوئی تھی۔

سلیمان کو موقع ملا تو اسے اشارے سے کوارٹر کے دوسرے کمرے میں بلایا۔ وہ بغیر کسی خوف کے کمرے میں چلی آئی۔ سلیمان سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جس نے ایک پل کے لئے اسے مایوس کیا۔ سلیمان کے چہرے پر اسے ایسا کوئی تاثر

نہیں دکھائی دیا جس سے محسوس ہوتا کہ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے بلایا ہو یا اس میں ایسی کوئی تڑپ ہو جو اس کے ہم عمر نوجوانوں میں ہوتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بھیگی مورنی کی طرح مڑی، دروازے تک ہی پہنچی تو اس کے ٹھنڈے کپاس جیسے کانوں سے گرم الفاظ ٹکراتے ہوئے سماعتوں تک پہنچے، "ایک بات ہے، کہنے والے نے ٹھیک کہا تمہارے لئے!"

اس نے پہلی بار سلیمان کا مکمل جائزہ لینے کے لئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے بال بھورے تھے، رنگ سانولا، آنکھیں بہت چھوٹی اور حیرت انگیز طور پر پلکیں بڑی اور بھویں بالکل ہلکی تھیں، اس کے ہونٹ بہت سیاہی مائل تھے لیکن اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کے چہرے میں کہیں کہیں کچھ خوبصورتی بھی جھلک رہی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور پھر ایک دم سے ایسے واپس ہوئی کہ سلیمان کو لگا جیسے کسی بچے نے غصے سے دروازہ بند کیا ہو۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا، "کیا کہہ رہے ہیں؟"

پہلے تو وہ تھوڑا سا سہم گیا لیکن جلد ہی خود کو سنبھال لیا، "کہتے ہیں کہ بالکل اداکارہ شبنم جیسی ہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ باہر سے میوزک کے ساتھ عورتوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ موسیقی میں قہقہوں کے بے سرے پن کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ سلیمان کی اس بات پر وہ مشکل سے دو تین سیکنڈ کے لئے حیران ہوئی، ہنستے ہوئے بولی، "یہ بات تو ساری دنیا کرتی ہے، پورے محلے میں فقط تمہاری بہن سنبل ہی مجھے اپنے اصل نام شبانہ سے پکارتی ہے۔" وہ اس کی طرف بڑھ کر آئی اور اس کی شرٹ کے کالر کو پکڑتے ہوئے کہا، "چھوڑو ان کو، تم اپنی بات کرو۔"

چارپائی سے اٹھ کر وہ کمرے کے درمیان میں آیا۔ سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے کہنے لگا، "اب یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ تمہارا ریلوے کے جن بھی ملازمین یا بوڑھے ملازمین کے بیٹوں سے یارانہ ہے وہ سب کلاس فور کے ملازم ہیں۔"

وہ پہلے تو کچھ سنجیدہ ہوئی، لیکن بعد میں اچانک ہنسنے لگی، اتنا ہنسی کہ اسے پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ سلیمان اس دوران بار بار اس سے پوچھتا رہا، "ہنس کیوں رہی ہو؟" بتاؤ نہ۔۔ بتاؤ!!"

"بس چھوڑو اس بات کو، کبھی بعد میں بتاؤں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا، "اب تم بتاؤ کلاس فور کے ملازم کے بیٹے، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

سلیمان نے سگریٹ کا بڑا کش لگایا، "تمہیں کبھی یہ خواہش ہوئی ہے کہ تم گریڈ تھری کے کسی ٹکٹ کلکٹر، ٹی ٹی یا کسی گارڈ کی محبوبہ بنو؟" سلیمان اپنے لہجے اور سنجیدگی کے باعث اب بائیس سالہ اوباش نوجوان نہیں بلکہ چھوہارا منڈی کا چالاک بیوپاری لگ رہا تھا، "ویسے بھی جوانی اور حسن ایسا میوہ ہے جو ہمیشہ کے لئے تازہ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی ان کو ہر وقت کھانے سے بچایا جا سکتا ہے۔" سلیمان نے کہا۔

شبانہ کا باپ رحیم داد ریلوے میں نچلے درجے یعنی کلاس فور کا کال مین تھا۔ اس کی زندگی ان لوگوں جیسی تھی جو فقط اپنے لئے جینا چاہتے ہیں۔ اس کی شادی اس کی خالہ زاد سے ہوئی تھی۔ رحیم داد کو کلاس فور کی نوکری اپنے باپ کی وجہ سے دی گئی تھی جو انگریزوں کے دور سے ریلوے میں ملازمت کرتا تھا۔ جوانی میں ہی اس نے باپ کی دی ہوئی ہر چیز نشے کی عادت میں گنوا دی تھی۔ بس ایک کمرے والا یہی ایک کوارٹر ہی بچا تھا، جس کے لئے بھی اس کی بیوی کو اس کی مار جھیلنی پڑی تھی۔ وہ ایک کمرے والے اس گھر اور دوسرا اپنے جسم کو شوہر کی خواہش کے باوجود بھی دوسروں سے روندے جانے سے بچانے میں کامیاب رہی تھی۔

رحیم داد کی طبیعت میں کہیں سے بھی رحمدلی نظر نہیں آتی تھی۔ محلے داروں نے اسے کبھی بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ اس کچی دیوار کی مانند تھا جس میں بارش کے بعد نکلنے والی دھوپ سے دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ اس کی بیوی ذکیہ سانولی رنگت کی تھی۔ کم گو ذکیہ کے

بال اتنے لمبے تھے کہ اس کی عمر کا ایک حصہ ان کو سلجھانے میں بسر ہو گیا۔ رحیم داد سے مار کھانے کے بعد وہ آئینہ لے کر برآمدے میں چارپائی پر بیٹھ جاتی تھی اور پھر لکڑی کی کنگھی سے گھنٹوں اپنے بال سلجھاتی رہتی تھی۔

چھوٹے سے صحن کے ایک کونے میں پانی کے لئے ڈرم رکھا تھا اور وہی رسوئی بھی تھی۔ جبکہ غسل خانہ باہر والے دروازے کے ساتھ تھا، جس کا ٹوٹا ہوا کموڈ ذکیہ کی کئی مہینوں کی منتوں کے بعد تبدیل ہوا تھا۔ رحیم داد کا باپ اس کی شادی کے فوراً بعد فوت ہو گیا تھا۔ اس لئے ذکیہ کو اس گھر میں بیشتر وقت تنہا گذارنا پڑا۔ تنہائی اس کے زردی مائل چہرے جیسی تھی۔

اس کے سسر کی وفات کے بعد ایک دن رحیم داد کی غیر موجودگی میں گھر کے دروازے پر تین سے چار بار دستک ہوئی تو اس نے اندر سے ہی دستک دینے والے کا نام پوچھا تو باہر سے فقط دروازہ کھولنے کا اصرار ہوتا رہا۔ ابھی شام کا وقت تھا باہر چہل پہل تھی، اس کے باوجود بھی وہ اتنا ڈر گئی کہ چارپائی گھسیٹ کر دروازے کے آگے رکھ دی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فقط دروازہ کھولنے کا اصرار کیوں کیا جارہا ہے! جب باہر سے آواز آنا بند ہوئی تو اسے دستک دینے والے کا ایک جملہ زیادہ پریشان کرنے لگا کہ آخر وہ بار بار یہ کیوں کہہ رہا تھا، 'دروازہ کھولو ورنہ تمہارا شوہر تمہاری ایسی حالت کرے گا کہ عمر بھر یاد کرو گی۔'

اس رات رحیم داد بہت دیر سے آیا تھا۔ تب تک اسے ہر لمحے عجیب و غریب خیالات آتے رہے۔ ذکیہ ایسی کیفیت سے زندگی میں پہلی بار گذر رہی تھی۔ رحیم داد جیسے ہی گھر آیا تو وہ اسے ایسے چمٹ گئی جیسے شہد کی مکھی رات کو چھتے سے چمٹی ہوتی ہے۔ نشے میں دھت ہونے کے باوجود رحیم داد نے بیوی سے کچھ نہیں کہا اور چارپائی پہ خاموشی سے اس کی طرف پیٹھ کئے سویا رہا۔

دن نکل آیا تو رحیم داد بیوی کے پاس گیا، وہ چائے بنا کر اسی کے طرف ہی آرہی تھی۔ صحن میں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بنا کہا، "لگتا ہے رات تمہیں

نیند نہیں آئی؟"

ذکیہ نے مختصراً جواب دیا"نہیں!"

وہ مختصر "نہیں" اسے سسکی جیسی محسوس ہوئی۔ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ حالانکہ اس وقت دو ٹرینیں ایک دوسرے کو کراس کرتی گذری تھیں لیکن ان کا شور بھی ان دونوں کے درمیان موجود خاموشی کو توڑ نہیں پایا۔ چائے ختم کرنے کے بعد اس نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کپ وہیں رکھا۔ "میں لوکو شیڈ جا رہا ہوں۔" وہ دو قدم آگے بڑھا۔ بیوی کی طرف دیکھے بنا کہنے لگا، "آج رات میں نہیں آسکوں گا اور ہاں تم بھی انکار مت کرنا۔" حیرت کی ان گنت ٹرینیں اس کے اوپر چڑھا کر رحیم داد باہر نکل گیا۔ اس دن وہ سمجھ گئی کہ اس کا شوہر کیا چاہتا ہے۔

اس کے بعد روزانہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے شوہر سے مار پڑتی رہی۔ ذکیہ شوہر کے لئے نشے اور جوا کے پیسوں کا بندوبست کرنے کے لئے مختلف گھروں میں صفائی اور کھانا پکانے کا کام کرتی رہی۔ اس کے چہرے پر کسی نے کبھی بھی مسکان نہیں دیکھی، نہ کسی نے اس کا کبھی کوئی قہقہہ سنا تھا اور نہ ہی کسی کو اس کے کام سے شکایت ہوئی تھی یا اس پر کوئی شک کیا گیا تھا۔

شبانہ کے پیدا ہونے سے دس بارہ ماہ پہلے تک رحیم داد نے اپنی بیوی ذکیہ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا، ماسوائے اس دن کے جب شوہر کو باہر جاتے وقت ذکیہ نے کہا تھا، "آج گھر جلدی آنا۔"

اس نے پوریاں لانے کی بھی فرمائش کی تھی۔ اس سے پہلے اس نے اپنے شوہر سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔

اس دن رحیم داد کے من میں بھی میٹھی سی خاموشی چھائی۔ گھر جانے کی فکر پر اس کے موالی دوست بھی بہت ہنسے تھے، خاص طور پہ پوریاں لے جانے پر طنز بھی کیا۔ لیکن اس سے اس کی خاموش اور دھیمی کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ گھر آیا تو ذکیہ کو جیسے پر لگ گئے ہوں اور وہ

اڑنے لگی ہو۔ اس دن رحیم داد کو بھی عجیب سرور محسوس ہو رہا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا جب اس نے شوہر کے ساتھ لیٹے چھت کی اینٹوں کی گنتی نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے آدھی رات یا دن میں، جب بھی شوہر نے اسے اپنے ساتھ سلانے کے لئے بلایا تھا، وہ چھت میں لگی چار سو اسی اینٹیں، ایک گاڈر اور دس ٹی آئرن گنتی رہتی تھی۔ اس دن کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں کوئی دوسرا وجود بھی آ رہا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں خوشی کی ایسی لہر کبھی نہیں آئی تھی۔ شبانہ کے پیدا ہونے پر بھی وہ زیادہ خوش نہیں تھا لیکن شبانہ کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ اسے اپنی شادی والی زندگی کا وہ ایک دن یاد دلاتی تھی جو میاں بیوی نے ہنس کر بتایا تھا۔

اس نے شبانہ کو جنم دیا، اس دن اسے مسکراتا دیکھ کر پڑوس کی عورتیں حیرت زدہ تھیں۔ زچگی کے دوران درد کی شدت سے انہوں نے عورتوں کی فقط چیخیں اور چنگھاڑیں ہی سنی تھیں۔ اس نے اپنی ایسی کیفیت کا اظہار فقط دائی کے سامنے کیا تھا، "یہ درد اس درد کے آگے کچھ نہیں جو میں اس گھر میں بھگت رہی ہوں۔"

بچی کو جنم دینے کے بعد بھی وہ مختلف گھروں میں کام کرتی رہی۔ ذکیہ کو ایک ماہ کے دوران ہی محسوس ہو گیا تھا کہ شبانہ کم رونے والی ہے اور ہمیشہ ایک دلکش تبسم اس کے معصوم چہرے پر رہتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر کچھ مہینوں بعد اس نے کبھی اس کے رونے کی آواز نہیں سنی۔ شبانہ کو اس طرح دیکھ کر اسے سکون محسوس ہونے لگا۔ ایسا ہی سکون اسے شوہر کی غیر موجودگی میں قرآن پاک کی تلاوت سے ملتا تھا۔ شبانہ کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر اس کے ہاتھ رحل نما بن جاتے تھے۔ شبانہ اپنے چہرے پر ماں کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے ہلکے ہلکے سے قہقہے لگاتی تھی۔

شبانہ جوں جوں بڑی ہو رہی تھی ویسے اس کی شوخیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ اس نے باپ سے جب بھی لاڈ کرنے کی کوشش کی، وہ اسے نظر انداز کرتا رہا۔ لیکن یہ بھی عجب لڑکی تھی، باپ

کی کسی بات کا اثر دل پر نہیں لیا، جیسے جانتی ہو کہ یہ مٹی ہی ایسی ہے۔ شروع میں اس کے گھر سے باہر نکل جانے سے اس کی ماں کو پریشانی ہونے لگتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی عادی ہوگئی۔

ابھی سردیوں کا موسم شروع ہونے کو تھا اور شمال کی جانب سے ہوائیں آنا شروع ہوئی تھیں کہ ایک دن شبانہ نے اسے ایسی بات بتائی جس سے اسے محسوس ہوا جیسے ایک ہی لمحے میں سردی کا موسم شروع ہوگیا ہے۔ اس کا جسم کپکپانے لگا۔ شبانہ دروازے سے اچھلتی کودتی اندر آئی۔ اس کے پہنے ہوئے کپڑے میلے ہوگئے تھے، پاؤں میں چپل بھی نہیں تھی۔ اس کے پاس کپڑوں کے تین ہی جوڑے تھے اور ایک چپل تھی، جو اس کی ماں نے سنبھال کر رکھی تھی۔ کام پر جاتی تھی تو اسے پہناتی تھی۔ گھر میں آتے ہی وہ صحن میں رکھی چارپائی پر اچھل کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بہت خوش ہو۔ ذکیہ رسوئی میں روٹی بنا رہی تھی، رسوئی، صحن اور برآمدہ سب ایک ہی تھا۔ ذکیہ نے شبانہ کی طرف دیکھے بنا ہی پوچھا، "اتنا کھیلتی ہو، تھکتی نہیں؟"

"کیوں تھکوں گی، کونسا دس گھروں کا کام کرتی ہوں۔" ایسے جواب دیا جیسے کہ وہ بڑی ہوگئی ہو۔ "ہاں اماں، باہر نہ ایک بندہ کہہ رہا تھا۔" وہ چپ ہوگئی۔

روٹی توے پر ہی چھوڑ کر ذکیہ پریشانی سے وہاں سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور جلدی سے اس سے پوچھا، "کیا کہا اس نے۔!؟"

شبانہ کے چہرے پر وہی تبسم تھی۔ "اس نے کہا، بس باقی آٹھ دس خزاں کے موسم آئینگے، پھر تم تیار ہو۔"

شبانہ ابھی بات کرنا چاہتی تھی لیکن ذکیہ نے اسے زور سے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اس نے آسماں کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ بھی نہیں۔ جیسے اس نے جس سے شکایت کرنی تھی وہ کرلی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ شبانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اس کی ماں کو بھی جیسے چین مل گیا۔ "اماں یہ تو کوئی بڑی بات نہیں جس کی وجہ سے تم خواہمخواہ پریشان ہو رہی ہو۔" شبانہ نے

اپنے تئیں ماں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

ذکیہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور رسوئی کی طرف چلی گئی۔ چوکی پر بیٹھتے کہا، "تم باہر کم جایا کرو، مجھے پریشانی ہوتی ہے۔"

شبانہ بھی چارپائی سے اٹھ کر ماں کے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔

شبانہ کا باپ رحیم داد تنخواہ کا کچھ حصہ گھر میں خرچ کرتا تھا، بقیہ رقم اس کے کھانے پینے کے شوق میں ختم ہو جاتی تھی۔ پیسے ختم ہونے کے بعد وہ اپنی بیوی کو پیسوں کے لئے تنگ کرتا تھا۔ شروعات میں تو ذکیہ کے لئے یہ مرحلہ بہت مشکل تھا۔ اس کا شوہر پیسے نہ ملنے کی صورت میں گالی گلوچ کے علاوہ ایسے طعنے بھی دیتا کہ اس کے لئے سننا مشکل ہو جاتا۔ "تم کونسی آسماں سے اتری ہو؟ شمیر کی بیوی اپنے شوہر کو عیش کروا رہی ہے۔۔"

"دتے کی بیوی کے چرچے تو تم نے بھی سنے ہوں گے۔ اس کی بیوی تو کیا بیٹی بھی۔۔۔۔ اور کیا بتاؤں تمہیں! خوامخواہ اپنے آپ کو بھی ذلیل کر رہی ہو اور سارے گھر کو بھی بھوکا مارا ہے۔" ذکیہ اس کی باتیں سن کر بہت زیادہ پریشان ہوتی تھی۔ لیکن اسے شوہر پر کبھی غصہ نہیں آیا اور نہ ہی اس نے کبھی پڑوس کی ایسی عورتوں کی طرح گالیاں دیں جو کما کر آنے والے شوہروں پر سخت غصہ کرتی تھیں۔

شبانہ بڑی ہو رہی تھی، جس کا احساس خود اس کو کم لیکن اس کے باپ اور ماں کو اچھی طرح سے تھا۔ ایک سال کے بعد شبانہ نے بھی محسوس کیا کہ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی ہے، اس کے جسم میں تبدیلیاں آ رہی تھیں تو اس کی ماں کی پریشانیاں بھی بڑھ رہی تھیں۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کام کے لئے گھر سے نکلتی تھی تو کئی نوجوان، جنھوں نے لنڈا بازار کی پتلونیں پہنی ہوتیں، آگے سے گذرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ ان کی آپس میں ہونے والی باتوں کا مطلب ذکیہ سمجھ رہی تھی۔ اپنی طرف اٹھتی پسندیدگی والی نظروں کی بولی کا شبانہ بھی مسکراہٹوں کے ذریعے جواب

دیتی۔

اس دن تو ذکیہ ایک عجب خوف میں مبتلا ہو گئی، جس دن رحیم داد بیوی سے زبردستی چھینے ہوئے پیسوں سے شبانہ کے لئے دو سو روپے کا ریشمی جوڑا لایا تھا۔ ذکیہ حیرت سے جیسے مال گاڑی کی بند بوگی میں سے بول رہی ہو۔ اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز بازگشت کر رہی تھی۔

"شبانہ کے ابا،" اس نے کپڑوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، "آج کیسے!؟"

اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا پوچھے اور کیا کہے۔ اس کی زبان سے زیادہ اس کا چہرہ بول رہا تھا۔

"اس کا باپ ہوں تو کیوں نہ لے کر دوں۔" رحیم داد نے فخریہ انداز میں کہا۔ "اور ہاں لوگ کہہ رہے ہیں شبانہ بڑی ہو رہی ہے، کچھ اس کا خیال رکھو، کپڑے وپڑے لے کر دو، سو لے کر آیا ہوں۔"

اس دن کے بعد ذکیہ فکر مند ہو گئی لیکن شبانہ کی شوخیاں بڑھ گئیں اور غرور بھی۔ آئینے کے سامنے کھڑے بال سنوارتے ہوئے ماں کو کہتی تھی، "اماں اب آئینہ تو نیا لیں، اس میں خود کو دیکھ کر دل کہتا ہے توڑ دوں، سامنے آتی ہوں تو بالکل بیکار لگتا ہے۔"

ذکیہ نے اس کا جائزہ لیا۔ شبانہ اب قد آور لڑکی تھی۔ اسے کہیں سے بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ اب چھوٹی بچی ہے۔ رحیم داد نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ اس خوف سے فوری نکلنے کا اسے ایک ہی حل سمجھ آیا۔ اس نے طے کر لیا کہ شوہر کو بعد میں بتائے گی پہلے شبانہ کے لئے رشتہ تلاش کرے گی۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا۔ وہ اسی سوچ میں ہی تھی کہ اچانک شبانہ نے زور سے کنگھی رکھی اور ہلکا قہقہہ لگاتے ہوئے انتہائی معصومیت سے کہا، "اماں ایک کام تو کرو۔" ذکیہ نے شبانہ پر صرف نظر ہی ڈالی۔ "میری کسی سر پھرے حرامی سے شادی تو کروا دے، پڑوس کے کچھ لڑکوں کا دماغ خراب ہے۔ کوئی ان کو سیدھا تو کرے۔"

شادی کے بعد یہ دوسری دفعہ تھا جب ذکیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے پھیل گئی تھی جیسے کسی بچے نے گلابی کاغذ کی تیرتی ہوئی کشتی پر کوئی سفید پھول رکھ دیا ہو۔ وہ لمحہ شبانہ کے لئے بھی یادگار بن گیا۔ اس نے ماں کے چہرے پر ایسی کھلتی تبسم کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے دیکھا تھا تو تھوڑا سا اطمینان اور بے اطمینانی یا پھر خاموشی۔ ذکیہ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا، "ہاں سوچنا ہو گا۔ تمہیں دیکھ کر یہی سوچ رہی تھی کہ کوئی ایسا ہو جو تمہیں باندھ کر رکھے۔"

ہنس مکھ شبانہ اور بھی ہنسنے لگی جیسے کسی بیری کے درخت کو ہوا کا جھونکا کیا لگا، مسکراہٹوں کے میٹھے بیر گرنے لگے۔ اس کی ماں اسے پیار اور شفقت سے دیکھتی رہی۔

گذشتہ دو تین ماہ سے کھوکھے والے کریم بخش کا بیٹا جمیل بھی اسے دیکھ کر کہتا تھا۔ "بیری بہت کمال کی پکی ہے۔"

شبانہ بات کا مفہوم سمجھے بغیر اسے کہتی تھی، "جا جا تمہیں بیریوں کے بارے میں کیا معلوم، تم جا کر کچے ڈو کے کھاؤ۔"

جمیل نے ایک دو دفعہ تو یہ بات نظر انداز کر دی تھی، لیکن بعد میں جیسے اس کی چھیڑ بن گئی۔ جب اس کی ماں نے شادی کا اشارہ دیا تو اس نے بھی قہقہہ لگاتے ماں کو کہا، "لیکن کچے ڈو کے کھانے والا نہ ہو۔"

ذکیہ نے حیرت سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا، "تم نے ضرور یہ باہر سے سنا ہو گا۔"

"ظاہر ہے اماں! یہاں گھر میں بولنے والا کون ہے۔" شبانہ نے آرام سے جواب دیا۔

جب وہ سرد شام آئی تو دسمبر کا آدھا مہینہ گذر چکا تھا۔ اس برس سردی کا موسم کچھ دیر سے آیا تھا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ بادل چھا گئے اور چاروں طرف فضا میں سوندھی مٹی کی خوشبو پھیل گئی۔ تیز ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں، یوکلپٹس، پیپل، شیشم، بیری اور نیم کے پتے جھڑ کر روڈ پر بچھ گئے تھے۔

ایسا موسم دیکھ کر ذکیہ نے شبانہ کو پرچون کی دکان سے موم بتیاں لانے کے لئے بھیجا ۔وہ دکان جمیل کے کھوکھے کے پیچھے تھی۔ شبانہ نے جیسے ہی گھر کی دہلیز پار کی تو ٹھنڈی اور تیز ہوا نے اس کا استقبال کیا۔ پہلے اس کے چہرے کو معلوم ہوا کہ باہر سردی ہے اور پھر اس کے پورے جسم نے ہوا میں خنکی کو محسوس کیا۔ جیسے ہی اس کی نظر روڈ پر بکھرے پتوں پر پڑی اس کا چہرہ کھل اٹھا، اس نے یک دم اپنی اسپنج کی چپل اتار کر بغل میں دبائی اور ننگے پاؤں ان پتوں پر چلنے لگی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پتوں پر چلتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ کسی نرم قالین پر کھڑی ہے اور قالین آسمان میں اڑنے لگا ہے، نیچے پوری کائنات پر برف باری ہو رہی ہے۔ پتے دسمبر میں جھڑنے لگیں یا مارچ کے پہلے ہفتے میں، وہ ان پر ننگے پاؤں چلنے سے سکون محسوس کرتی تھی اور آگے چل کر پتے اس کی زندگی کا حصہ بن گئے۔ شبانہ عجب سرور کے ساتھ ان پتوں پر جیسے تیرتی ہوئی آگے بہی چلی جا رہی تھی۔ جیسے آسماں سے کوئی ندی اتر آئی ہو۔ جیسے وہ پتے نہیں چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں۔ اچانک ایک مضبوط پنجے نے اس کی کلائی کو جکڑ لیا۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی، ریل کو ایمر جنسی بریک لگنے کی طرح۔ اس کے ذہن کے مسافر خیالات بھی چونک گئے۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو جمیل اس کی کلائی پکڑے کھڑا تھا۔ اب اس نے اپنے خیالات میں بھی ایسا زوردار جھٹکا محسوس کیا جیسے پکے ہوئے بیر گرانے کے لیے کسی نے زور سے بیری کو ہلایا ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ اس ہلچل سے اس کے جسم سے اس کا بچپن کچے بیروں کی طرح زمین پر گر پڑا ہے۔ اس کے بغل سے اس کی چپل بھی گر گئی۔

اچانک جمیل کی نظر اپنے باپ کریم بخش پر پڑی، جو کچھ فاصلے سے آ رہا تھا۔ جمیل نے یک دم شبانہ کی کلائی چھوڑ دی، وہ گرتے گرتے بچی۔ جمیل جلدی جلدی میں کھوکھا بند کرنے لگا۔ اس نے سکھ کا سانس لیا کہ اس نے باپ کو دور سے دیکھ لیا، جہاں سے اس کی نظر ان پر پڑنے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کیونکہ اس کے باپ کی دور کی نظر بہت زیادہ کمزور تھی۔ جمیل جانتا تھا کہ

اگر اس کا باپ اسے شبانہ کی کلائی پکڑتے ہوئے دیکھ لیتا تو اسے بہت مار پڑتی۔۔

اسے ایک آدھ سال پہلے کی دو ماریں یاد تھیں، پہلی جب اس کے باپ کریم بخش نے اسے کانٹے والے کی بیٹی کے ساتھ مستیاں کرتے دیکھ لیا تھا تو اس کی بہت پٹائی کی تھی۔ لیکن اس کو اس سے زیادہ مار اس وقت پڑی تھی جب اس نے ایک گیارہ سالہ بچے سے زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پٹائی اسے کبھی نہیں بھولی تھی، جس کے رد عمل میں اس نے خودکشی کرنے کا بھی سوچا تھا۔ اسی دوران اس کے کچھ دوست مل گئے تھے جنہوں نے اسے بہت سمجھایا تھا اور پھر اس نے خود ہی اپنا فیصلہ تبدیل کر کے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق جیے گا۔ یہ بات جمیل کے لئے حیران کن تھی کہ وہ خود اپنا پیشوا بنا اور راہ راست پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ جبکہ اس کا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ باپ کی طرف سے سختی کے بعد باغیانہ خیالات پروان چڑھاتا رہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لوکو شیڈ میں ہی اس کے دوست سہیل نے باپ کو برا بھلا کہا تھا اور تیرہ دن گھر بھی نہیں گیا تھا۔ سہیل کو اس کی ماں منا کر گھر لے آئی تھی، جبکہ جمیل کا باپ زیادہ سخت گیر تھا۔

شبانہ کچھ دیر تک وہیں حیران کھڑی رہی۔ بے خیالی میں اپنی چپل وہیں چھوڑ کر گہرے بادلوں کی طرح آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ وہ باہر کیوں آئی تھی؟ یہاں کیسے پہنچی؟ اور واپس کیوں جا رہی تھی؟ اچانک بدلے ہوئے موسم کی طرح اس نے اپنے جسم میں بھی کئی چیزیں بدلتی ہوئی محسوس کیں، ماسوا اس تبسم کے جو ہر حال میں اس کے ہونٹوں پر دلہن کے سنگھار کی طرح سجا رہتا تھا۔

جس دن جمیل نے شبانہ کی کلائی پکڑی تھی، اس دن جمیل کی عمر انیس برس اور پورے تین ماہ تھی۔ وہ سانولے رنگت و مناسب قد کا تھا، بدن کسرتی تھا لیکن چھالیہ کھانے کے باعث اس کے دانت زیادہ صاف نہیں تھے۔ وہ اکثر لنڈا بازار سے خریدی ہوئی سرمئی رنگ کی جینز پہنتا اور ٹی

شرٹ پسند کرتا، الٹی پی کیپ پہن کر وہ خود کو فلمی ہیرو تصور کرتا تھا۔ سردیوں میں نیلے رنگ کی جینز والی جیکٹ پہنتا تھا، جس کے بارے اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ سال میں ایک مرتبہ بھی دھلتی تھی یا نہیں۔ جب تک اس نے ہوش سنبھالا، تب تک اسے صرف ایک دفعہ عید کے موقعے پر بازار سے خریدے ہوئے نئے کپڑے ملے تھے، اس وقت اس کی عمر گیارہ برس تھی اور تین سال پہلے، دوسری مرتبہ اس کی بڑی بہن کی شادی کے موقع پر نئی قمیض شلوار خرید کر دی گئی تھی۔

جمیل کی نظریں شبانہ کے انتظار میں بیتاب رہتی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شبانہ کے لئے کون سے نوجوان دو دو تین تین بار اس راستے سے گذرتے تھے، مڑ مڑ کر اس کے گھر کی طرف جھانکتے تھے، گرتے سنبھلتے تھے یا پھر درختوں سے ٹیک لگا کر کھڑے رہتے تھے۔ گذشتہ چند مہینوں کے دوران چار بندوں کے آپس میں جھگڑے بھی ہوئے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی شبانہ سے بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ اس محلے میں ایک جمیل ہی تھا جس کی شبانہ سے گفت و شنید ہو رہی تھی۔ وہ جیسا اندر سے تھا ویسا ہی ظاہر میں تھا۔ جمیل کے پاس اس کے ہم جولی آتے تو اکثر یہی سوال کرتے تھے:

"تم کیسے اس سے بات کر لیتے ہو؟"

"وہ تم سے کیا کہتی ہے؟"

"سچ بتاؤ! اسے کون پسند ہے؟"

"دل کی کیسی ہے؟"

"تم نے اس سے پوچھا کہ وہ ہم سے اتنی خفا کیوں رہتی ہے؟"

جمیل ایسے سوالوں پر قہقے لگا کر ہنستا اور اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا، "جس کو پسند کرتی ہے اسی سے ہی تو بات کرتی ہے۔"

ان میں سے ایک دو کے چہروں کا رنگ اڑ جاتا تھا۔ کچھ من ہی من میں شبانہ سے بات

کرنے کا ارادہ کر لیتے تھے، اگر لفٹ نہ کرائی تو بے عزت کرینگے۔ کچھ کے دل میں جمیل کے خلاف غصے کی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور پھر کوئی نہ کوئی حسد کرتے کہہ دیتا تھا، "جا جا شکل دیکھی ہے اپنی، دکھائی بھی مور جیسے دیتے ہو، وہ تمہیں پسند کریگی؟۔"

شروع میں جمیل کو ایسی باتوں پر غصہ آتا تھا اور اس کے بہت سے جھگڑے بھی ہوئے ۔ جن لڑکوں سے اس نے لڑائی کی تھی، انہوں نے اجنبیوں کے ہاتھوں اس کی بھی پٹائی کروائی تھی۔ کبھی اس کے دوست درمیان میں آکر بیچ بچاؤ بھی کراتے تھے اور صلح بھی ہو جاتی تھی۔ جمیل نے محسوس کیا کہ یہ لڑائی جھگڑا فضول ہے تو آہستہ آہستہ اس نے خود پر ضبط کرنا شروع کیا اور کچھ مہینوں بعد لڑنا جھگڑنا بند کر دیا۔ دوسروں کو ایسے جلتے بھنتے اور بے چین ہوتے دیکھ کر اُسے مزا آتا تھا۔

☆☆☆

شبانہ بھی دھنک دیکھنے کے لئے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ پٹری کی پرلی طرف نہ تو گھنے درخت تھے اور نہ ہی زیادہ عمارتیں۔ اسی لئے جنوب مشرقی کونے میں شام کے وقت بادلوں پر دھنک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں دھنک دیکھ کر شور وغل مچا رہے تھے۔ شور شرابے میں شبانہ کے علاوہ بوڑھے کریم بخش کا جملہ کسی اور نے نہیں سنا۔ اگر سنا بھی تو اس نے نظر انداز کر دیا، "شکر ہے دھنک نکل آئی، اب بارش سے جان چھوٹی۔"

شبانہ نے خوشی سے کہا، "ہاں چچا؟ یہ تو بہت اچھا ہوا۔"

کریم بخش نے شبانہ پر گہری نگاہ ڈالی۔ شبانہ میں اسے بچپنا نہیں دکھائی دیا، روکھے لہجے سے پیشانی پر سلوٹیں ڈال کر کہا، "تم اب بچی نہیں ہو کہ گھر سے اکیلی نکلی ہو۔ گھر جاؤ۔ شاباش!"

شبانہ نے مسکرا کر، دھیمی آواز میں کہا، "ٹھیک ہے چچا جا رہی ہوں، بس تھوڑی دھنک دیکھ لوں۔ یہاں سے صاف نظر نہیں آ رہی۔ تھوڑا آگے جا کر دیکھتی ہوں۔"

کریم بخش کو حیرت زدہ چھوڑ کر وہ ریل کی پٹری تک آئی اور دھنک کی گولائی میں گم ہو گئی۔ اس کے کانوں میں ایک آواز آئی، "تم بھلے ہی دھنک کو دیکھو! لیکن ہم سب تو تمہیں دیکھ رہے ہیں، قسم سے ایسی حسین اور رنگین تو یہ دھنک بھی نہیں ہے۔"

وہ نوجوان کون تھا یہ دیکھنے کے لئے وہ مڑی لیکن تب تک وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ یہ جملہ کہہ کر، وہ نوجوان مڑ کر ایسے تیز بھاگا، جیسے کسی ریل نے اسپیڈ پکڑی ہو، شبانہ کے دل میں بھی خوشی کے رنگوں جیسی دھنک بکھر گئی۔

جب وہ گھر پہنچ کر سوئی تو اسے ساری رات سرخ رنگ کے خواب آتے رہے۔ تین دنوں کی برسات کے بعد وہ شدید سرد رات تھی۔ سرخ رنگ کے خوابوں میں اسے پوری دھنک بھی سرخ لگ رہی تھی تو آسماں بھی سرخ تھا۔ ریل کی پٹریاں بھی سرخ تھیں، سونے اور جاگنے کی اس کیفیت میں اس نے ماں کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو وہ بھی سرخ تھا۔ اس کی کچی نیند بھی سرخ تھی تو گہری نیند کا بھی یہی رنگ تھا۔

شبانہ صبح سویرے جاگی تو اٹھ کر بیٹھ گئی، چارپائی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اس لئے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی رہی۔ اس طرح بیٹھے ہوئے اسے کافی دیر گذر گئی۔ اس نے شال اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر چمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے جسم میں عجیب قسم کی تبدیلی کے احساس کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اپنی سوچ پر بھی ہنسی آ رہی تھی کہ وہ اب جوان لڑکی کہلائے گی۔ ذکیہ جاگی تو اس نے شبانہ کو کپڑوں کی گٹھڑی کی طرح بندھا ہوا دیکھا۔ ایک دم سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی، "تمہیں تو بخار ہے۔"

"نہیں اماں بخار تو نہیں ہے، بس جسم میں تناؤ محسوس ہو رہا ہے۔" شبانہ نے انگڑائی لیتے ہوئے ماں کو بتایا۔

" تمہیں کہا تھا نا کہ، بارش سے بچو، زیادہ باہر نہیں نکلو۔ تم کب باز آتی ہو۔" ذکیہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "دیکھو اب بیمار پڑ گئی نا۔"

شرم سے شبانہ کے چہرے پر ہلکی سی لالی چھاگئی، جو ماں کی نگاہ سے چھپ نہ سکی، اس نگاہ سے بچنے کے لئے اس نے بات کا رخ تبدیل کرنے کے لئے کہا، "اماں بارش کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا۔ میں تو سردی اور گرمی کی بارشوں میں بھیگتی رہتی ہوں۔ تم بیٹھو میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

شبانہ ماں کی پریشانی دور کرنے کے لئے ایک دم سے چادر ہٹا کر چارپائی سے اتری اور باہر چلی گئی۔ ہلکے رنگ کے کپڑوں پر پڑے سرخ رنگ کے دھبوں نے ذکیہ کو چونکا دیا۔ شبانہ نے بھی محسوس کر لیا کہ جوانی کی آنے والی برسات اس کی ماں کی نگاہوں سے نہیں چھپ سکی۔ جب اسے محسوس ہوا کے اس کی ماں کی نظروں نے راز بھانپ لیا ہے تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ باہر سے چائے بنا کر واپس آئی تو بھی وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ماں نے پوچھا، "ہنس کیوں رہی ہو؟"

"پریشان ایسے ہو رہی ہو جیسے تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں تھا اور تم جھٹ سے کبھی کی طرح جوان ہو گئی تھی۔"

ذکیہ نے اطمینان کے ساتھ اسے کہا، "بس بس، اب کچھ تو شرم کرو۔"

"اماں تمہیں قسم ہے آنکھوں کے نور کی۔" اس کی آنکھوں پر اپنے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں رکھ کر کہا، "جب تمہیں پہلی ماہواری آئی تھی تو تمہیں کیا لگا تھا اور کیسے ہوا تھا؟" شبانہ کے لہجے میں محبت بھی تھی اور شرارت بھی۔

"بہت روئی تھی۔" ذکیہ نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

شبانہ اور زیادہ ہنسنے لگی، "کیوں اماں؟"

"مجھے لگا کہ یہ کوئی بیماری ہے۔ میری دادی بھی زندہ تھی۔ اسے بتایا، پھر اماں کو بتایا۔ میں جتنا رو رہی تھی وہ اور بھی ہنسے جا رہی تھیں۔ ان کو ہنس ہنس کر پسلیوں میں درد ہو گیا تھا اور میں اتنا روئی تھی کہ گلا بھی درد کر رہا تھا۔ مجھے تیز بخار بھی ہوا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اماں بخار کی گولی بھی نہیں کھانے دے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی ان دنوں میں گولی لینا صحیح نہیں ہے۔ تو پھر تین دن بخار میں کاٹے۔" ذکیہ بات ختم کر کے چپ ہو گئی اور شبانہ کی طرف دیکھا، جو ہنسے جا رہی تھی اور خود کو بڑے بڑے قہقہے لگانے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ذکیہ یکدم سنجیدہ ہو گئی، "شبانہ دھیان سے سنو، یہ بات ذہن نشیں کر لو کہ تم اب بچی نہیں رہی، گھر سے بلا وجہ باہر جانا بند کر دو۔"

شبانہ نے گردن ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ جیسے تازہ کھلا ہوا پھول ہوا میں جھوم رہا ہو۔ اس نے اپنے بدن میں جوانی کی دستک کو محسوس کیا۔ اپنی کلائی کو دیکھا، جمیل کے ہاتھ کی گرفت کا احساس ہوتے ہی اس کا بدن لرز گیا۔

☆☆☆

یہ تو ذکیہ بھی جانتی تھی کہ شبانہ کی کچھ سہیلیاں ایسی تھی۔ جنہوں نے شبانہ کو جوانی کے سارے راز بتائے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس محلے میں کچھ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جو جوانی تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ لڑکوں یا کچھ چالبازوں کے چنگل میں پھنس گئی تھیں اور کچھ ایسی درمیانی عمر کی بھی تھیں، جو اپنی جوانی کے ڈھلتے سورج سے دن میں بھی آسماں پر چاند کو اپنے ساتھ لے کر اندھیرے کمرے یا کچھ جگہیں روشن کرتی تھیں۔

ذکیہ کا جسم ابھی ڈھلا نہیں تھا، اس کے چہرے میں سلوٹیں تھیں نہ ہی اس کی رونق ماند پڑی تھی۔ صرف یہ فرق آیا تھا کہ اس کے خدشات دوگنے ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بارے کیا کیا

نہیں سنا تھا، وہ شعلہ شعلہ نگاہوں اور جذبات کی گرمی سے دور ہٹتی رہتی تھی۔ لیکن شبانہ جیسا شعلہ خود اس سے بھی بڑا خدشہ تھا۔ ذکیہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ شعلہ نہیں لیکن ایک الاؤ ہے جو جلدی بھجنے والا نہیں۔۔

مارچ کے مہینے میں جہاں موسم کی مہربانیوں سے فطری حسن میں نکھار آ گیا تھا، وہیں ذکیہ کے گھر میں بھی شبانہ پھل پھول کر درخت بن گئی تھی اور اس کے حسن کے نئے نئے غنچے کھل رہے تھے۔۔ ذکیہ کام کرنے کے لیئے کلاس تھری کے گارڈ فیاض کے گھر نیو یارڈ کالونی پہنچی۔ وہ شبانہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ سب گھر والے شادی کی دعوت میں گئے ہوئے تھے، گھر میں صرف فیاض ہی تھا۔ فیاض ذکیہ کو راضی کرنے کے لئے کوششیں کر کر کے قریباً مایوس ہو چکا تھا، لیکن اس دن اس نے شبانہ کو دیکھا تو اسے اپنے خیالوں میں ہلچل محسوس ہونے لگی۔ پینتالیس برس کے صحتمند فیاض نے بر آمدے میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے ذکیہ کو آواز دی۔ جب ذکیہ اس کے پاس پہنچی تو اس نے اس سے شبانہ کے بارے میں کہا، "تمہاری بیٹی تو بڑی ہو گئی، پتہ ہی نہیں چلا!"

ذکیہ کو کو ایسا زوردار جھٹکا لگا جیسے چلتی ہوئی ٹرین کو روکنے کے لئے کسی نے لیور کھینچ دیا ہو اور ٹرین اچانک رک گئی ہو۔ اس کے منتشر خیالوں کا شور اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ ذکیہ اپنے برابر میں کھڑی شبانہ کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔ فیاض بھی سمجھ گیا۔ یکدم لہجے میں عام رواجی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا، "میں نے تو بس ایسے ہی کہا، بہت عرصے بعد دیکھا ہے نا۔"

شبانہ سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور شرارتی انداز سے کہنے لگی، "چچا پرسوں جو آئی تھی، شاید آپ اپنی بیگم سے ناراض تھے، اس لئے نہیں دیکھ سکے ہونگے۔"

فیاض نے شرمساری محسوس کی اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا لیکن اس کی نظریں شبانہ کے سراپے کا مکمل جائزہ لیتی رہیں۔ غصے، خفگی اور طنز میں وہ بڑبڑایا۔ "چچا!۔۔" فیاض نے اپنا ہاتھ داڑھی پر پھیر کر کہا، "ٹھہرو۔۔۔!"

جب دونوں گھر واپس آ رہی تھیں تو راستے میں شبانہ اچانک رک گئی۔ اس کے من میں آیا کہ وہ چند لمحے اکیلی ہو کر ٹہلے اور پھر گھر جائے۔ ذکیہ اچھا خاصا آگے نکل گئی تو اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ اکیلی ہے، مڑ کر دیکھا تو شبانہ بیچ راستے میں کھڑی تھی۔ وہی مسکراہٹ لیکن اب چہرے پر بچپنے کا کوئی تاثر نہ تھا، "اماں میں کچھ دیر کے لیے سنبل کے پاس جاؤں گی، آدھے گھنٹے میں آتی ہوں۔"

ذکیہ کے لئے اس کے ساتھ بحث کرنا فضول تھا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس نے ٹھنڈی آہ لی اور گھر کی جانب چلی گئی۔ لیکن اُس وقت شبانہ کے دل میں تھا کہ وہ اس راستے پر تنہا تنہا گھومے۔ وہ راستہ لوکو شیڈ کی بجائے اسٹیشن کو جاتا تھا۔ دونوں اطراف نیم، پیپل اور سنبل کے درخت تھے۔ کہیں کیکر اور شیشم کے درختوں کے علاوہ شیشم کے بوڑھے درخت بھی تھے۔ وہ اس راستے پر چلنے لگی۔ سردی میں ٹھنڈی ہواؤں، اور مارچ میں بہار کے موسم کی تیز ہوائوں نے سوکھے ہوئے پتوں کے ساتھ ایسی کاروائی کی تھی کہ سنبل کے درخت بے لباس ہو گئے تھے۔ شیشم اور نیم کے درختوں کی ٹہنیاں بھی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہی تھیں، اور پتے گرنا شروع ہو گئے تھے۔ ساتھ ہی ہرے پتے نئے پیرہن کی طرح ٹہنیوں پر موجود تھے۔ شبانہ پیپل کے پتوں پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کسی جانب بھی نہیں دیکھ رہی تھی، لیکن وہ اپنی طرف دیکھنے والوں کی دلوں کو درختوں کے پتوں کی طرح روندتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے لئے سب کے دل پیپل کے پتوں جیسے تھے۔ تیز ہوا کے ساتھ درختوں کے شور پر اس نے سنبل کے درختوں کی جانب دیکھا، اس کی کمر جیسے سیدھے اور قد آور درخت۔ اسے لگا جیسے سنبل کی ٹہنیوں میں کومل کونپلوں نے اچانک سرگوشی کی ہو، "ابھی دیکھنا، اجاڑ کے بعد نیا لباس آئے گا۔"

ایسی سرگوشی سن کر کیکر، شیشم، نیم اور دوسرے درختوں کی ٹہنیاں تیز موسیقی کے

ساتھ ہجر کا ایسا گیت گانے لگیں جس کے آخر میں ملن کے ترانے تھے۔ محبت کے نغمے تھے۔

شبانہ موسم بہار کی ساری مسرتوں، خوشبوں اور خوبصورتی کی پاکیزگی کی سرشاری کے ساتھ اآگے بڑھتی جا رہی تھی۔ سندھ میں موسم بہار کی یہ بھی خوبصورتی ہے کہ پتھروں پر بھی پھول کھل جاتے ہیں اور صحرا کے درختوں کو بھی سبز لباس اوڑھا دیتا ہے۔ اس کی جوانی کے صاف اور شفاف آسمان پر بہار نے ابھی ابھی قدم رکھے تھے۔

بچپن کے دن کیسے بیت گئے اسے پتہ ہی نہ چلا۔ جوانی کی دستک وہ اپنے بدن سے روح تک محسوس کر رہی تھی۔ اس کی جوانی ایسے آگئی تھی جیسے اروڑ کے پہاڑوں پر پھول کھلے ہوں۔ وہ اور اس کی ماں جس طرح کی زندگی بسر کر رہی تھی وہ بہت سخت تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آنے والا وقت اس کے لئے کیا ہو گا؟ کیسا ہو گا؟ جس لمحے میں وہ جی رہی تھی اس میں صرف اور صرف جوبن کا خمار تھا۔۔ نوجوانوں کی نگاہوں کے پیچھے اسے صرف سچائی اور وفا کی تلاش تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ محبت اس کے دل کے دروازے پر ایسے دستک دے رہی تھی، جیسے سرد راتوں میں ہوا کسی تنہا اور بند گھر کے دروازے پر لٹکتی کنڈی کو کھٹکھٹاتی ہے۔ اس کا زمیں پر پڑنے والا ہر قدم ایسے تھا جیسے پاؤں کنول کے پھولوں پر پڑتے ہوں۔ آگے بڑھتے ہوئے اسے کو دھیان آیا کہ وہ کہاں پہنچ گئی ہے۔۔ اس نے دیکھا کہ وہ ریل کی پٹریاں کراس کر کے اس تالاب تک پہنچ گئی ہے، جسے کنول کے بڑے بڑے ہرے پتوں نے ایسے ڈھانپ دیا تھا، جیسے پنچھی گھونسلے میں انڈوں کے اوپر پر کھول کر بیٹھتے ہیں۔ ٹھہرے ہوئے پانی کے اس تالاب میں جب کنول کے پھول ہوتے ہیں تو دو چھوٹی کشتیوں میں مچھلی کے شکار کے لئے ماہی گیر بھی موجود ہوتے ہیں۔

شبانہ نے اس راستے سے آتے ہوئے دو آنکھیں محسوس کی تھیں جو اس کا مسلسل پیچھا کر رہی تھیں۔ ایسی تیرتی آنکھیں جیسے کنول کے پھولوں کے درمیاں دو چھوٹی کشتیاں۔ ایک دو بار

اس نے مڑ کر بھی دیکھا تھا، لیکن کوئی بھی اس کے پیچھے نہیں تھا۔ کچھ تو تھا جو اسے یہ احساس دلا رہا تھا، وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ یہ اس کے روح کی سرگوشی تھی یا اس کے اندر کی آس تھی جو یہ چاہتی تھی کہ اس کے چہرے کے سامنے کوئی ایسا ہو جسے وہ اپنے پورے وجود میں محسوس کر کے سپردگی کے احساس سے سرشار ہو جائے۔۔ ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ مٹی کی مہک آئی۔ اس نے گہرے سانس لیے اور اس خوشبو کو اپنے روح میں انڈیل دیا۔ مٹی کی مہک بھی تو محبت کی طرح آتی ہے۔ ٹرین گذر گئی لیکن وہ کئی لمحے اپنی سانسوں میں مٹی کی مہک محسوس کرتی رہی۔ بچپن سے ہی وہ ریل کی پٹری کے نزدیک کھڑی رہتی تھی، ریل کی تیز ہوا مٹی کی بو کو کھود کر ہوا میں پھیلا کر چلی جاتی تھی۔

اس وقت اس کی آنکھیں بند تھیں، مٹی کی خوشبو کے ساتھ اس نے ایک ایسے وجود کی مہک کو اپنے قریب محسوس کیا، جس کی ان دیکھی تڑپ اسے کئی دنوں سے تھی۔

اس کی کلائی کو ایک پنجے نے جکڑ لیا، اس کا جسم لرز گیا۔ شبانہ نے آنکھیں کھولیں۔ قریب میں جمیل کھڑا تھا۔ اس کا سارا جسم کانپ گیا۔ اس کے خیالات، اس کے حواس اور اس کے سامنے سارے منظر سفید رنگ میں گم ہو گئے، ماسوا اس کی مسکراہٹ کے، جو گلابی رنگ کے جیسی چمک رہی تھی، بالکل اس کے روح کی طرح۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کس وقت جمیل نے اس کی کلائی چھوڑی اور کس وقت اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا؟ اور کس وقت اس نے اپنا دل سنبھالا۔ جمیل اس کے شفاف پانی جیسے چہرے کو تکتا رہا۔ شبانہ کی آنکھیں تو کھل گئیں لیکن اس کے لئے جمیل ابھی تک سفید رنگ میں تحلیل تھا۔ آہستہ آہستہ اسے جمیل کا وجود اپنے سامنے کھلتے ہوئے محسوس ہوا، جیسے صاف سفید کنواس پر کوئی شاہکار تخلیق ہو رہا ہو۔۔ آہستہ آہستہ مناظر صاف ہونے لگے۔ احساسات کی پاکیزگی اور مناظر کی تازگی آس پاس کی گندگی اور بدبو پر حاوی ہو گئی۔ ۔اس کے بدن کی مادی ضرورتیں ایسے ڈھپ گئیں جیسے کائی زدہ پانی کنول کے پھولوں کے نیچے

ہو۔ جمیل کا بے کشش چہرہ بھی اب اسے نیلے آسمان کی طرح لگ رہا تھا، جس پر دوڑتے سفید بادل ایک دوسرے میں سما جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے کرنیں ایسے نکل رہی تھیں جیسے چلتی ٹرین کے قریب ڈوبتا سورج جھانک رہا ہو۔

"شبانہ، تم سے ملنے کے لئے میں نے لمبا انتظار کیا ہے، ایسا انتظار جیسے مسافر عید سے پہلے اپنے گھروں کو جانے کے لئے اسٹیشن پر کرتے ہیں۔" جمیل کی گمبھیر آواز اسے بھی اسی شدت کیساتھ محسوس ہوئی، "بہت دفعہ چاہا کہ تم سے ملوں، تم سے بات کروں لیکن موقعہ نہیں ملا۔ اور اگر ملتے بھی رہے ہیں تو بھی نہ ملنے جیسے، بس راہ چلتے ہوئے۔"

جمیل نے محسوس کیا کہ اس جگہ زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے، "اگر ہم ان مال گاڑیوں کے پاس چل کر بیٹھیں، تمہیں اعتراض تو نہیں ہو گا؟" جمیل نے تھوڑے فاصلے پر کئی سالوں سے پٹریوں سے نیچے گرے ہوئے مال گاڑیوں کے دو ڈبوں کی طرف اشارہ کیا، جو ایسے کھڑے تھے جیسے دو بوڑھے آپس میں باتیں کر رہے ہوں۔

جمیل کے لہجے میں اتنی التجا تھی کہ شبانہ نے کہا، "ہاں چلو۔" اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ وہ جمیل کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔

دونوں کو مختصر فاصلہ طے کرنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ راستے میں دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کی خاموشیاں ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہیں۔

"کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟" شبانہ نے خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان تھی۔

جمیل نے اس کی چہرے پر نگاہ ڈالی، اسے لگا کہ حسن فقط چہرے کی خوبصورتی نہیں ہے، حسن آگ کے گلابی شعلے کی طرح بھی ہے۔ محبوب کی نگاہ فقط گرج چمک یا آسمانی بجلی ہی نہیں ہے، لیکن وہ قیامت خیز قحط کے بعد آنے والی بھری برسات بھی ہے۔ فقط سجدہ ہی عبادت نہیں ہے

لیکن محبوب کو نظر سے روح تک محسوس کرنا بھی عبادت ہے۔ جوانی کے جوبن کو پانے کے لیئے جمیل نے اپنے بدن کی شوخیوں سے کئی دیواروں میں دراڑیں ڈالی تھیں لیکن آج اس کا روح جس صاف وشفاف پانی سے دھل رہا تھا، اس کا اس نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ لڑکیاں یا خوبصورت لڑکے دیکھ کر اس کے بدن کی ہوس اسے پاگل کر دیا کرتی تھی، لیکن آج اس کے برعکس وہ اس پر سکون احساس کے سبب خود بھی حیران وپریشان تھا۔ شبانہ کے سوال سے اسے ایسے محسوس ہوا جیسے سفید بادلوں میں سے کوئی آواز آئی ہو، "بتاؤ بھی یا میں چلی جاؤں!"

"نہیں نہیں، یہ غضب مت کرنا۔" جمیل نے عجلت سے کہا، "شبانہ، تم مجھے بچپن سے ہی پسند ہو۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تمہیں اچھا نہیں لگتا لیکن تم نے مجھ سے کبھی بھی نفرت آمیز رویہ اختیار نہیں کیا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تم لڑکوں کی کیسی درگت بناتی ہو۔" اچانک جمیل نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "تھک جاؤ گی، نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔" جمیل نیچے بیٹھ گیا اور شبانہ بھی بیٹھ گئی۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" شبانہ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

جمیل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، "میں نے کہا نہ، شبانہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ لیکن تم یہ بھی جانتی ہو کہ میرا باپ کتنا سخت مزاج انسان ہے۔"

شبانہ کے ذہن میں اچانک اپنے باپ رحیم داد کا چہرہ ابھر آیا، جو اسے اس لئے پسند نہیں تھا کیونکہ وہ ہمیشہ اس کی ماں کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرتا تھا۔

"میں نے اپنے باپ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا، جس کے باعث شبانہ نے دوبارہ اس کی طرف دھیان دیا۔

"کیا ماننے کے لئے تیار نہیں؟" شبانہ نے پوچھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ تم لاہور سے ٹریننگ کر کے آؤ۔" جمیل نے ادھوری بات کی۔

"میں تمہاری بات سمجھی نہیں؟" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔

جمیل نے قریب میں پڑا پتھر اٹھایا، سر جھکا کر، پتھر کے ساتھ مٹی کھرچتے ہوئے کہا، " میں نے ابا سے کہا کہ مجھے تم سے شادی کرنی ہے، لیکن اس نے پہلے تو صاف انکار کیا اور جب میں نے ابا سے کہا کہ پھر میں لاہور نہیں جاؤں گا تو وہ غصہ ہو گئے۔"

شبانہ کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ درمیان میں اس کی بات کاٹنا چاہی لیکن کہہ نہ سکی۔ جمیل کی یہ باتیں بن موسم برسات کی طرح برس رہی تھیں جن میں شبانہ کے سارے خیالات ڈوبتے گئے۔ اس کے تو وہم و گماں میں بھی نہیں تھا کہ جمیل ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے اور اس سے شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔

"میرے باپ نے سفارش سے میری بھرتی کروائی ہے۔ میں ریل کے اسسٹنٹ ڈرائیور کی ٹریننگ کے لئے لاہور کی ریلوے اکیڈمی والٹن جا رہا ہوں۔ گیارہ بارہ مہینے تمہیں دیکھے بنا گذارنا، تمہاری باتیں سنے بغیر دن گذارنا میرے لئے بہت تکلیف دہ ہوگا اور اس کے بعد بھی یقین نہیں ہے کہ وہ۔۔۔"

شبانہ کی مسلسل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے جمیل نے ایک دم سر اٹھایا تو شبانہ اسے گھور رہی تھی۔ اس نے شبانہ کی آنکھوں میں دیکھا، اسے محسوس ہوا جیسے دو بچے مسکرا کر اس کی جانب دیکھ رہے ہوں، "معاف کرنا شبانہ، میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں اور یک طرفہ بولتا جا رہا ہوں۔ تم بتاؤ میں تمہیں پسند بھی ہوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے تو صاف بتا دو۔ اپنے پیار کی قسم میں تمہاری زندگی سے ایسے غائب ہو جاؤں گا جیسے یہ کچھ وقت کے بعد یہ مال گاڑیاں اسکریپ میں فروخت ہو جائیں گی۔" جمیل نے وہاں کھڑی مال گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شبانہ اپنے اندر کوئی چیز تلاش کرنے لگی، لیکن اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا تلاش رہی

ہے۔اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جمیل جو باتیں کر رہا ہے، وہ ایک نئی زندگی کی نوید تھیں، خوشی کا پیغام تھیں۔ لیکن وہ اس کا اظہار نہ کر سکی اور اچانک اٹھ کر کھڑی ہو گئی، "میں نہیں بتا سکتی!"

"لیکن کیوں؟" جمیل نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں مجھے کچھ وقت درکار ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے دو دن بعد لاہور جانا ہے۔ بس اتنا بتا دو کہ میرا انتظار کرو گی؟" جمیل نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔

شبانہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا جواب دے۔ جمیل کو جواب کے انتظار میں چھوڑ کر، وہ وہاں سے دوڑتی اپنے گھر پہنچی اور دو دن تک گھر سے باہر نہیں نکلی۔

☆☆☆

جمیل کے لاہور جانے والے دن، شام کو وہ گھر سے باہر نکلی۔ اسے دنیا بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پہلی بار اسے اپنے ہونٹوں پہ مسکراہٹ، لپ اسٹک کی طرح محسوس ہوئی، جسے وہ چاہ کر بھی جدا نہ کر سکی، جیسے یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کی میچنگ ہو۔ خالی خالی گلیاں، خالی آسمان، بچوں کا شور بھی اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے خزاں میں تیز ہوا کے ساتھ درختوں سے پتے جھڑ رہے ہوں۔ اس کو یہ کیفیت ایسی ہی نئی لگی تھی جیسی جمیل کی جانب سے پہلی بار کلائی پکڑنے کے بعد اس کو اپنے جسم میں محسوس ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ کھوکھے کہ قریب پہنچی، جمیل کے باپ کریم بخش کی نئے ریگمال جیسی کھردری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی، "تم خوش نہ ہونا کہ تمہاری شادی جمیل سے ہو گی۔ تمہارے باپ کو بتا دیا ہے کہ جلد تمہاری شادی کرا دے۔ جمیل ریل ڈرائیور کی ٹریننگ کر کے آئے گا تو ہم لوکو شیڈ سے پرلی نیو یارڈ کالونی شفٹ ہو جائیں گے۔"

شبانہ کا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ کریم بخش کی آواز جیسے ٹین کے ڈبے سے آ رہی ہو۔" اللہ کا شکر ہے کہ میری پرانی خدمت کی وجہ سے ڈی ایس صاحب راضی ہو گئے اور جمیل کو نوکری کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا، نہیں تو وہ تمہارے جال میں بری طرح پھنس گیا تھا۔" کریم بخش نے ڈانٹنے والا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا، "تمہارے لئے بھی یہی اچھا ہے کہ جہاں تمہارا باپ چاہتا ہو وہیں شادی کرلو۔"

شبانہ سوتی دھاگوں کی طرح الجھ گئی اور کریم بخش کو جواب دیئے بنا آگے بڑھ گئی۔

چچا کریم بخش نے تو خیر جو کہا، لیکن جمیل میرے لئے کیا ہے؟ میں نے مسلسل تین راتیں اس کے بارے میں کیوں سوچا؟ یہ خواہش کیوں ہو رہی تھی کہ وہ لاہور نہ جائے۔ میرا دل کیوں چاہ رہا تھا کہ میں دوڑ کر اس کے پاس جاؤں، اسے روک لوں۔ اس کی منتیں کروں۔ دوڑ کر اس کے پاس نہیں بھی گئی ہوں لیکن اس نے مجھے محسوس کیا ہو گا کہ میں اسے روک رہی ہوں۔

وہ چلتے چلتے نیم کے درخت کو ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ جمیل اس کی سوچ کے آسمان پر گھنے بادلوں کی طرح چھا گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی اور تھوڑی دیر بعد اس کے مسکراتے ہونٹوں نے نمکیں ذائقہ بھی چکھا۔ شام گھنی ہونے لگی تو اسے مچھر کاٹنے لگے اور وہ وہاں سے اٹھ کر واپس گھر روانہ ہوئی۔ راستے میں وہی کوارٹر تھا جس کی ایک طرف کی دیوار گری ہوئی تھی اور صحن میں اس کا باپ اور اس کے موالی دوست بیٹھے رہتے تھے۔ وہ جیسے ہی وہاں سے گذری، کوارٹر کے صحن میں بیٹھے گلزار کی نظر اس پر پڑ گئی۔ گلزار ہیروئن کے نشے کا عادی تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا جس پر کپڑے ایسے لگتے تھے کہ اس کے دوست کہتے تھے، "یار گلن، لگتا ہے جیسے یکتارے پر چولی چڑھی ہوئی ہے۔"

وہ اکثر نسواری رنگ کے کپڑے پہنتا تھا۔ اس کا نام گلزار سے گلن ہو گیا تھا۔ وہ گلو کے نام سے بھی مشہور تھا۔ لو کو شیڈ میں اس کی دو دو کانیں تھیں، جن میں سے اب ایک رہ گئی تھی۔

کیونکہ اس نے جوئے اور نشہ کرنے کے لئے ایک دوکان فروخت کردی تھی۔ اس کی عمر ۴۸ برس تھی۔ اس کی ریلوے میں کال مین کی نوکری تھی۔ جو اسے ۱۹ برس کی عمر میں ملی تھی۔ جیسے ہی اس کی سروس ۲۵ برس ہوئی اس نے نوکری سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ وہ تن تنہا تھا، نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ ماں باپ بھی فوت ہوچکے تھے۔ نوکری کے آخری سالوں میں اس نے چرس کا استعمال اور جوا کھیلنا شروع کردیا تھا۔ نوکری سے ریٹائرمنٹ لینے تک نشہ اور جوا اس کی عادت نہیں بنے تھے۔ اس لئے اس نے ریٹائرمنٹ کے پیسوں سے وہاں دو دوکانیں کھولیں تھیں۔ ایک پرچون کی دکان خود کھولی اور دوسری کرائے پر چڑھادی۔ شروع میں دکان پر وہ خود بیٹھتا تھا، لیکن جیسے جیسے وہ نشے کا عادی بنتا گیا تو دوکان پر نوکر رکھ لیا۔ میخانہ اس کا ٹھکانہ بن گیا، جہاں دن رات افیون، بھنگ، شراب اور چرس کے دور چلتے تھے۔

جب شبانہ وہاں سے گذری تو گلزار تین آدمیوں کے ساتھ سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ رحیم داد اوٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا یا اس پر قہر کی کوئی دیوار گرنی تھی کہ ٹوٹی ہوئی دیوار کی طرف لکڑیوں پر ٹنگی ہوئی چادریں گر پڑی تھیں، جہاں سے وہ گھر واپس جاتے گلزار کو نظر آگئی۔ ویسے بھی انسان کے مشکل دنوں میں مصیبتوں کو بھی ہاتھ پیر لگ جاتے ہیں۔ جب وہ کوارٹر کے دروازے کی طرف سے گذر کر آگے جارہی تھی تو اس نے گلزار کی للچائی ہوئی آواز سنی، جو یقیناً اس کے باپ سے مخاطب تھا، "ارے رحیم داد تمہاری بیٹی تو بالکل جوان ہوگئی ہے، ابھی کل ہی کی بات ہے، ہمارے سامنے بچوں کے ساتھ کھیلتی تھی، واہ رے وقت۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے جانے لگی۔ اس بات سے اسے محسوس ہوا کہ پیٹھ پیچھے مذاق بھی ہوتا ہوگا۔

گھر پہنچنے کے بعد شبانہ بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ ماں اس کے لئے کھانا لے کر آئی لیکن اس

نے نہیں کھایا۔ پہلی بار ذکیہ اپنی بیٹی کے لئے پریشان ہوگئی، اس نے شبانہ سے کئی مرتبہ پوچھا، "مجھے بتاؤ، کیا ہوا ہے؟ میں تمہاری ماں ہوں۔!" شبانہ خاموش رہی تو ذکیہ نے پیار سے کہا، "بتاؤ گی تو من کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

لیکن شبانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذکیہ کو پہلی بار یہ احساس بھی ہوا کہ شبانہ کے ہونٹوں پر ہر وقت آسمان کی طرح موجود رہنے والی مسکراہٹ بھی رو رہی ہے۔ ذکیہ نے اسے سینے سے لگایا۔ شبانہ نے اپنی سسکی محسوس کی۔ جب تک اسے نیند نہ آئی تب تک وہ اپنی ماں کے نرم اور کومل احساس کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی رہی اور اس کی کلائی پر پانچ انگلیوں کے کڑے کا سخت احساس تھا۔

☆☆☆

شبانہ کے باپ کی رحم دلی بھی اس کی صحت کی طرح چلی گئی تھی، اسے دمے کے ساتھ تین چار دوسری بیماریاں بھی لگ گئی تھیں، لیکن اس کی بیوی ذکیہ کو ان بیماریوں سے زیادہ شوہر کے رویے سے خوف آتا تھا۔ وہ رحیم داد کی شراب اور جوئے کی عادت کو بیماری کہتی تھی تو گھر میں کچھ کما کر نہ لانا اور نکمار ہنے کو بھی بڑی بیماری سمجھتی تھی۔ اس کی حرص بھری عادتیں، ذکیہ کے لئے کینسر تھیں، جیسے وہ اس کے شوہر کے خمیر میں شامل تھیں۔

ذکیہ کو ہمیشہ یہی خوف رہتا تھا کہ وہ شبانہ کے معاملے میں کچھ غلط کرے گا، لیکن جو رحیم داد کرنے والا تھا وہ ذکیہ کے اندازے سے بہت زیادہ تھا۔ وہ رات اس کے لئے پنوں عاقل کے قریب سانگی میں پیش آنے ریل کے حادثے جیسی تھی، جس میں تین سو سے زائد لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔ وہ اس رات بھی حادثے والی رات کی طرح ہی سوگوار تھی، جب لو کو شیڈ میں

ریلوے ملازمین کے جنازے آئے تھے، وہ حادثہ اس کی کچی جوانی کے دنوں میں پیش آیا تھا۔ رحیم داد بھنگ، چرس اور کچی شراب سے بھری پلاسٹک کی پوری بوتل پینے کے بعد آدھی رات کو گھر پہنچا تو دراوزے پر ایسی آواز ہوئی جیسے لکڑی کا بھاری ٹکڑا دروازے سے ٹکرایا ہو۔ وہ سمجھ گئی اور اٹھ کر دروازہ کھولا، رحیم داد نشے میں دھت تھا، ذکیہ سہارا دے کر رحیم داد کو برآمدے تک جیسے تیسے گھسیٹ کر لائی۔ رحیم داد اپنے منہ میں بڑبڑاتا رہا۔ جب وہ چارپائی پر لیٹ گیا تو بیوی کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ ذکیہ اس کے پاس آئی تو رحیم داد نے اپنے دائیں ہاتھ سے جیب پر تھپکی لگا کر کہا، "میں۔۔۔امیر۔۔۔ا۔۔آد۔۔۔آدمی ہوں۔"

ذکیہ نے اس کی بھری ہوئے جیب دیکھی، جس میں سو سو اور پانچ پانچ سو کے نوٹ آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اتنے نوٹ دیکھ کر چونک گئی اور گھبرا کر پوچھا، "یہ اتنے پیسے تمہیں کس نے دیئے ہیں۔۔؟

"گ۔۔۔گ۔۔گلزار!۔۔۔۔یہ صرف پیشگی ہے۔۔"انگلیوں سے پانچ کا اشارہ کرتے ہوئے، "پانچ ہزار ہیں" اس کی زبان بھی اس کی طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

"لیکن کیوں؟" ذکیہ نے حیرت اور خوف سے پوچھا۔

"شبانہ۔۔۔۔ا۔۔۔اس کی بیوی بنے گی۔۔۔ہاں۔" رحیم داد نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔

نشے میں ڈوبے ہوئے رحیم داد کو نیند آگئی اور ذکیہ پریشانی میں جاگتی رہی۔

وہ رات اس نے کیسے کاٹی، ایک ایک پل اس کے لئے کیا تھا، یہ صرف ذکیہ کو ہی پتا تھا۔ رحیم داد اور شبانہ بے خبر سو رہے تھے۔ شدید سر درد کی باعث اس نے دو دفعہ الٹی بھی کی۔ سر درد کی شدت حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ دن نکل آئے اور اسے حقیت معلوم ہو۔ ذکیہ رات بھر یہ دعائیں بھی مانگتی رہی کہ یہ سب جھوٹ ہو۔ لیکن دن حقیقت کی روشنی بن گیا۔

رحیم داد کو صبح چائے پاپے دیتے ہوئے اس نے پوچھا، "تمہارے پاس یہ پیسے کہاں سے آئے ہیں؟"

رحیم داد نے اس سے چائے لیکر اس میں پاپا ڈبوتے ہوئے لاپرواہی سے جواب دیا، "گلزار نے دیئے ہیں۔"

"کس لئے؟" ذکیہ نے پوچھا۔ وہ خوف میں مبتلا ہو گئی۔

"شبانہ کہاں ہے؟" رحیم داد نے جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا۔

میں نے اسے پڑوس میں بھیجا ہے، آجائے گی۔ اس نے بے چین ہو کر دوبارہ اس سے پوچھا، "ادا گلزار نے تمہیں پیسے کیوں دیئے ہیں؟"

رحیم داد پاپا کھا چکا تھا اور چائے سے چسکیاں لیتے ہوئے سوچ کی چسکیاں بھی لینے لگا کہ سیدھی بات کرے یا ابھی انتظار کرے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اچانک ذکیہ سے کہا، "گلزار کے ساتھ ایک سودا کیا ہے، لیکن فی الحال تمہیں نہیں بتاؤں گا!"

"پھر اس سے کوارٹر کے لئے پگڑی لی ہے کیا؟" ذکیہ نے اپنے اندازے سے بات کو مزید کریدنے کے لئے پوچھا۔ وہ جس خوف میں مبتلا تھی، اس کے لئے یہ بات بڑے اطمینان کا باعث بن سکتی تھی، اگر اس کا شوہر اس کے سوالوں کے جواب میں ہاں کہتا لیکن اس نے گردن نفی میں ہلا کر ذکیہ کو ہی ہلا کر رکھ دیا۔

"تو پھر کس لئے دیئے ہیں یہ پیسے؟" مجھے فوراً بتاؤ!" رحیم داد شادی کے بعد پہلی بار ذکیہ کا ایسا تیکھا، ترش اور فیصلہ کن لہجہ سن رہا تھا۔

وہ اچانک اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا تو ذکیہ ہاتھ کھول کر ایسے آگے بڑھی جیسے کوئی چرواہا غلط سمت جانے والے ریوڑ کے سامنے آجائے اور انہیں سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کر رہا ہو۔ رحیم داد نے کسی باؤلے جانور کی طرح اسے دھکا دیا۔ ذکیہ دریا کے اندرونی بند کے کنارے کی طرح نیچے گر گئی اور وہ پانی کے تیز بہاؤ کی طرح دروازے سے باہر نکل کر چلا گیا۔

نیچے گرنے کے سبب ذکیہ کو پیٹھ پر چوٹیں آئیں، لیکن اسے چوٹوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ خوف میں مبتلا تھی، کافی دیر تک زمین پر ہی بیٹھی رہی یہاں تک کہ شبانہ بھی واپس آگئی، جسے پڑوس میں اس لئے بھیج دیا تھا تا کہ وہ شوہر سے پوچھ سکے کہ اس نے گلن سے پیسے کیوں لئے ہیں؟

رحیم داد سرکاری کوارٹر دوسروں کو دینے کے لئے چھ دفعہ پگڑی (بیانہ) لے چکا تھا، جو ذکیہ نے ہی ادا کیے تھے۔ منت سماجت یا پاک کتاب کا واسطہ دے کر یہ چھت بچائی تھی۔

شبانہ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ اس کی ماں کے ساتھ رحیم داد کس طرح کا سلوک کرتا تھا۔ اس نے ماں کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھا، "اماں پھر کیا ہوا ہے؟"

ذکیہ نے کچھ نہیں کہا، بس اندر ہی اندر تڑپتی رہی۔ وہاں سے دونوں کمرے میں آئیں۔ ذکیہ کمرے میں آنے کے بعد خود کو سمیٹنے لگی۔ شبانہ کو پانی لانے کا کہا۔ چارپائی پر بیٹھ کر کچھ غور کرنے لگی۔ اس کے چہرے پر خاموشی چھا گئی تھی۔ سردیوں میں نہر کے گہرے پانی کی طرح اس کی سوچ کی گہرائی بھی گرم تھی، لیکن اس کے چہرے کی سطح ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ شبانہ پانی لے آئی۔ ذکیہ نے اسے اپنے برابر میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پانی لے کر پیا۔ پڑوس کے بچوں کے شور اور ٹھیلے پر سبزی فروش کی آواز نے کمرے کی خاموشی کو بھگا دیا تھا، لیکن جب ذکیہ نے بولنا شروع کیا تو دونوں کی سماعتوں کے لئے جیسے باہر کی آوازیں تھیں ہی نہیں۔

"میری سوہنی بیٹی!" شبانہ نے محسوس کیا کہ اس کی ماں کی آواز صاف سفید بادلوں کو چھو کر آرہی ہے۔

"جی اماں۔" اس نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ تمہاری زندگی میں مصیبتوں کے دن شروع ہو رہے ہیں۔ کچھ بارشیں رحمت کی بجائے زحمت بھی بن جاتی ہیں، میں دیکھ رہی ہوں کہ میری زندگی کی کمزور دیوار اب درد کی ہواؤں کا زور شاید زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکے گی۔" ذکیہ کچھ دیر خاموش رہی۔

شبانہ کی طرف دیکھا، جو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی، "تمہارے باپ کی کال مین کی نوکری ہے، لیکن کچھ سال بعد ریٹائر ہو جائیگا۔" اس نے کمرے کی چھت پر نگاہ ڈال کر کہا، پھر شاید اس چھت کو بچانا بھی مشکل ہو جائے، خیر۔۔۔ میں جس خوف میں مبتلا ہوں وہ تم سے وابستہ ہے۔"

شبانہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، "اماں تم میری فکر نہیں کرو اور نہ ہی کوئی خوف۔"

"تم ابھی بچی ہو۔" ذکیہ نے سنجیدگی سے کہا، "جو زندگی ہم بسر کر رہے ہیں، وہ دن بہ دن خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔ تمہارا باپ انتہائی گرا ہوا انسان ہے۔ وہ اپنی ضرورتوں کے لئے تمہیں۔۔۔ میں تمہیں۔۔۔ تمہیں۔۔۔ کیا بتاؤں اور کیسے سمجھاؤں۔" ذکیہ نے بے چین ہو کر کہا۔

چارپائی سے اٹھ کر، اس کے سامنے کھڑی ہو گئی، "شبانہ تم جمیل کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لو۔ میں جانتی ہوں وہ تمہیں اچھا لگتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جمیل نے بھی تمہارا رشتہ مانگنے کے لئے اپنے باپ سے بات کی تھی لیکن کریم بخش تمہارے باپ کے کرتوتوں کی وجہ سے ذرا بھی تیار نہیں ہے، تم بتاؤ اس سے شادی کرو گی نا؟"

شبانہ کو لگا کہ بند کمرے سے ٹھنڈی ہوا گذر گئی ہو، "اماں جمیل تو لاہور گیا ہے۔"

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ذکیہ کہنے لگی، "ہاں مجھے پتا ہے، لیکن وہ ایک دو ہفتے میں چکر ضرور لگائے گا۔" ذکیہ کے چہرے پر خوف ایسے تیر رہا تھا جیسے پانی کے اوپر تیل۔ "شبانہ جب تک جمیل نہیں آتا اور تم اس سے بات نہیں کر لیتیں تب تک تم اس گھر میں نہیں ٹھہرو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

"تو پھر کہاں جاؤں گی؟" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ میں تمہیں بتاتی ہوں، بس تم تیار رہنا۔" ذکیہ نے گمبھیر لہجے سے کہا، جیسے وہ کچھ دیر کے لئے ذہنی طور پر غائب ہو گئی ہو۔ وہ سارا کچھ کہہ تو گئی، لیکن اس کے لئے کوئی راستہ نکالنے میں الجھ سی گئی تھی، اس کے دور کے رشتے داروں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کرے۔ وہ سوچنے

لگی کہ بیٹی کو رہنے کے لئے کہاں بھیجے۔

شبانہ نے اس کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا، "دیکھ میری اماں! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ ایسی کیا بات ہے جو تم اتنا پریشان ہو رہی ہو؟"

ذکیہ بہت زیادہ پریشان تھی، اس کے ذہن میں بہت سارے سوال گردش کر رہے تھے لیکن اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ شبانہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا: "اماں کام پر نہیں جاؤ گی کیا؟"

ذکیہ نے کوئی جواب نہیں دیا فقط شبانہ کی طرف دیکھا۔ شبانہ کو لگا کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔

"اماں میں سنبل کے گھر جا رہی ہوں، بہت دن ہو گئے ہیں، اس سے گپ شپ نہیں ہوئی۔" شبانہ کی اس بات نے جیسے ذکیہ کے تھکے ہوئے بدن میں توانائی بھر دی ہو۔

اس دن ذکیہ نے شبانہ کو سنبل کے گھر چھوڑا، اسے لگ رہا تھا کہ شبانہ کو ایک دن کے لئے پناہ مل گئی ہے۔ ذکیہ اس کے لئے ایک ایک دن کی پناہ کا سوچ رہی تھی۔ اسی سوچ میں وہ فیاض کے گھر پہنچ گئی۔ دروازہ فیاض نے ہی کھولا، اس نے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ اسے فیاض کی نظریں چھری کی نوک کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، ذکیہ نے اپنی ہمت کو یکجا کرتے ہوئے فیاض سے پوچھا، گھر کے دوسرے افراد!۔۔۔؟"

فیاض نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ برآمدے میں کھڑی ہوئی ذکیہ کے کانوں میں آواز آئی، "ذکیہ، پہلے یہ کمرہ صاف کر دو، مجھے جانا ہے۔"

ذکیہ اس دن دوہرے خوف میں مبتلا ہو گئی۔ وہ درمیانی عمر میں تھی، لیکن اس کی جسامت اور چہرے نے اس کی عمر چھپادی تھی۔ ابھی بھی وہ پرکشش اور من کو بھاتی تھی۔ اس کے شوہر کے لئے اس کی کشش بے معنی تھی۔ فیاض کے کمرے میں پہنچنے کے بعد اس کا وجود، اس کی

سوچ اور اس کا بدن اس کے بس میں نہیں تھا۔ اپنی کلائی میں پڑا ہاتھ بھی نہ چھڑا سکی نہ ہی حلق اور زبان پر خوف کی خشکی سے الفاظ اور روح کی چیخ کو آزاد کرا سکی۔ اس کی زندگی کا وہ دن ایک کے بعد ایک مصیبتیں لے کر آیا تھا۔

اس طوفان کو وہ کیسے جھیلے گی، اس سے بے خبر ہوگئی۔ کیسی شبانہ کی پریشانی، کون سا گھر چھن جانے کا خوف، اس کے لئے سب کچھ بے معنی ہو گیا۔

ذکیہ وہاں سے کیسے نکلی اور کہاں جارہی تھی، اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ بے خبر صرف آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے ذہن کو خالی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے فیاض کو دھتکار کر خود سے تو دور کر دیا تھا لیکن ایک فیاض اسے ایک سو فیاض جیسا لگ رہا تھا۔ اسے ریل کی پٹریوں کے بیچ مغرب کی جانب جاتے ہوئے فقط ایک گیارہ سالہ بچے نے دیکھا تھا۔

کسی کو خبر نہ ہوئی کہ ذکیہ کہاں چلی گئی۔ دو دن بعد چار سے پانچ کلو میٹر دور ریل کی پٹریوں کے نزدیک کے گاؤں والوں کو ایک لاش ملی تھی، جسے پہچاننا ممکن نہیں تھا۔ گاؤں والوں کا خیال تھا کہ یہ عورت ریل کے دروازے پر کھڑی تھی اور چلتی ریل سے گر کر مر گئی۔ ایک دو لوگ تو اس بات کے گواہ بن گئے کہ یہ واقعہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اید ھی والوں کے ذریعے اس عورت کی لاش کو لاوارث بتا کر دفنایا گیا تھا۔

لوکوشیڈ میں اس عورت کے متعلق خبر تین ماہ بعد پہنچی تھی۔ لیکن ان تین مہینوں میں شبانہ بہت تبدیل ہوگئی تھی۔ بدلتے وقت نے اس کے ہونٹوں پر چسپاں مسکراہٹ چھین لی تھی۔ وہ ماں کی یاد میں اتنا روئی کہ کوئی اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس نے آنسوؤں سے جھیل بھر دی تھی، جو ایسے چھلکی کہ اس کا وجود اس ایلیے میں بہنے لگا تھا۔ کئی بار اسے لگا کہ گھر کی ساری اینٹیں اس کے اوپر گر رہی ہیں۔ راتوں کو پاگلوں کی طرح چیخ کر اٹھ جاتی تھی، اس کا باپ اس کے دکھوں میں ذرا بھی حصے دار نہ ہوا، اس نے بیوی کی تلاش تو نہیں کی تھی، لیکن

اس کی گمشدگی پر شکرانے بڑے ادا کیئے تھے۔ باپ کے ایسے رویے کے باعث شبانہ کے دل میں ماں کی محبت اور یاد مزید بڑھ گئی تھی۔ اس نے اپنے دل میں ماں کا مزار بنادیا جسے وہ روزانہ خیالوں کی خوشبو سے نہلاتی تھی۔ کبھی کبھار اس کے پاس سنبل آتی تھی اور اسے اپنے گھر لے جاتی تھی۔

☆☆☆

گذرتے دنوں کے ساتھ وہ خود کو سنبھالنے لگی۔ ماں کے احساس کو اس نے وجود دینا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اسے احساس ہونے لگا کہ اس کی ماں مری نہیں ہے۔ اس نے یہ خیال پھر کبھی مرنے نہیں دیا۔ وہ ہفتے مہینے بعد گھر سے نکل کر ریل کی پٹریوں کے پاس کھڑے ہو کر مغرب کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اس نے سالوں بعد بھی اس انتظار کو کبھی ختم نہیں کیا۔ شبانہ پٹریوں کے پاس یہ آس لگا کر کھڑی ہوتی تھی کہ مغرب کی طرف اتر جانے والی اس کی ماں شاید ابھر آئے۔ اس کی آنکھیں ریل کی پٹری کی سطح کی طرح چمک جاتی تھیں۔ لیکن اس کے یہ خیالات ریل کی ان پٹریوں جیسے ہی تھے جو ساتھ تو چل رہی تھیں لیکن مل نہیں سکتی تھیں۔

جب اس کی ماں کو بچھڑے تین ماہ گذرے تھے۔ وہ گھر کے صحن میں بیٹھی تھی تو اس کا باپ گھر آیا۔ ان چند مواقع میں سے یہ ایک موقع تھا جب اس نے اپنے باپ کو نشے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس آیا۔ شبانہ کو ایک شاپر ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا

"بیٹی شبانہ یہ لو اس میں تمہارے لئے کپڑے بھی ہیں اور گھر کے لئے کچھ راشن بھی ہے"۔

شبانہ نے حیرت سے رحیم داد کی طرف دیکھا، اسے لگا کہ وہ برسوں بعد اپنے باپ کو دیکھ رہی ہے۔ رحیم داد کے بال سفید ہو چلے تھے، چہرہ بالکل موالیوں جیسا تھا۔ آنکھیں اندر ہو گئی تھیں۔ رنگ سانولا، ایک گال اور دائیں طرف سے پیشانی کی چمڑی کالی ہو گئی تھی۔ گلے میں منکر

اور گہرے بھورے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کی جسامت ایسی ہو گئی تھی جیسے کپڑے لکڑیوں پر لٹک رہے ہوں۔ وہ شبانہ کے سامنے اس طرح کھڑا تھا جیسے ابھی صدا دیگا کہ، " اماں اللہ کے نام پر پانچ روپے دے دو، دو دن سے کھانا نہیں کھایا۔"

شبانہ نے سوچ میں ڈوبے لہجے کے ساتھ پوچھا، "یہ کس لئے ہیں؟" ابا لفظ اس کے حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح پھنس گیا۔

"تمہاری شادی کا جوڑا ہے۔" رحیم داد نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

شبانہ کو کچھ دیر تک تو بات ہی سمجھ میں نہ آئی اور حیرت سے باپ کی طرف دیکھتی رہی۔

"میں نے گلزار کے ساتھ تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے۔" رحیم داد کے لہجے میں سختی تھی، "یہ جوڑا اس لئے خرید لیا ہے کہ کہیں پیسے خرچ نہ ہو جائیں، دو تین ماہ بعد اس سے تمہارا نکاح ہو گا۔"

اس نے جیسے شبانہ کے سر پر پتھر دے مارا ہو، اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔ اس کے ہاتھ سے شاپر گر گیا۔ رحیم داد نے شاپر اٹھا کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا، "تمہاری ماں کو بتا دیا تھا، اس نے بھی رضامندی ظاہر کی تھی۔" یہ کہہ کر رحیم داد گھر سے باہر نکل گیا۔

اس دن سے شبانہ سمجھ گئی کہ اب اس کی زندگی میں دکھ اور تکلیفیں بڑھنے والی ہیں۔ اسے سنبل کے علاوہ اور کوئی نہ سوجھا، جس سے وہ اپنے دکھ بیان کر سکے۔ وہ اپنے دکھوں کی نئی شروع ہونے والی داستان سنانے کے لئے اپنی سہیلی سنبل کے گھر پہنچ گئی۔ جب وہ وہاں پہنچی تو سنبل گھر میں نہیں تھی۔ سنبل کی ماں رفعت اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئی کہ شبانہ اب دکھوں کی ماری ہے۔ موتیئے جیسے مہکتے چہرے پر چھائی ہوئی خاموشی کو پڑھنا اور سمجھنا رفعت کے لئے بہت آسان تھا۔ شبانہ نے اسے اپنے باپ کی بات چیت سے آگاہ کیا۔ رفعت انتہائی چالاک اور ہوشیار

قسم کی عورت تھی۔ اس نے شبانہ کو پانی پلایا اور اس کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔ "شبانہ تم میرے لئے سنبل جیسی ہی ہو۔ اب تمہاری ماں بھی نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جوانی کچھ دنوں کی مہمان بن کر آتی ہے۔ ان دنوں میں انسان کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ یہ جانے والی چیز ہے۔" رفعت یہ بات کرتے ہوئے ایسے دکھی ہو گئی جیسے کوئی ایسی چیز ہاتھ سے نکل گئی ہو، جسے اس نے پال پوس کر بڑا کیا ہو، "اس لئے اس مہمان جوانی کی موجودگی کا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔" رفعت نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، "تمہارا باپ جس موالی سے تمہارا بیاہ کر رہا ہے، اس سے اس نے پیسے لیے ہیں۔ تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ تم شادی اسی سے کرو، لیکن زندگی اپنی مرضی سے گذارو۔"

شبانہ سنبل کی ماں کی باتوں کا مطلب سمجھ رہی تھی۔ اسے سنبل کے بارے میں بھی پتا تھا کہ اس کے کس کس سے کس طرح کے تعلقات ہیں اور اس نے رفعت کے بارے میں بھی بہت کچھ سن رکھا تھا کہ جوانی سے لے کر ڈوبتی جوانی تک اس کے کون سے قصے رہے ہیں۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ رفعت نے ہنسی مذاق میں اسے پہلے بھی کئی مرتبہ کہا تھا: "تمہاری ماں جیسی پاگل میں نے کوئی نہیں دیکھی، جو خوامخواہ اپنی عمر آگ میں جلا رہی ہے۔ تم فضول میں خود کو نہ جلانا۔" غصے میں شبانہ کے جسم کو تو آگ لگ جاتی تھی، لیکن اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ رہنے والی مسکراہٹ پانی کا کام کر جاتی تھی۔

شبانہ نے سنبل کا کافی انتظار کیا، اس نے دیر کی تو وہ وہاں سے اپنے گھر واپس آگئی۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتوں کی گرہیں بندھتی گئیں۔ اس کے ہونٹوں کی ابدی مسکراہٹ دکھوں کے سائے تلے ضرور آگئی تھی، لیکن اس کے ہونٹوں کی یہ عادت موسم کی طرح نہیں تھی کہ پتوں کی طرح جھڑنے لگے۔ اس کی مسکراہٹ دکھوں کی دھول میں دب گئی تھی، لیکن جب ان ہونٹوں پہ گرم ہوا چلی اور ان پر ہونٹوں کے لمس سے وہ گلابی پھولوں کی مانند کھل اٹھے۔

رفعت سے ملنے کے دوسرے دن وہ جیسے ہی گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر اسے

بند کرنے لگی تو وہ ایسے کھل گیا جیسے کوئی طوفانی ہوا چلی ہو اور ہوا کا جھونکا بھی اندر داخل ہو گیا ہو۔ دروازہ یکدم بند بھی ہو گیا۔ وہ حیرانگی سے دیکھتی رہ گئی۔ سامنے جمیل کھڑا تھا۔ مسکرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور شبانہ کو اپنی طرف کھینچ کر پہلے پیشانی اور پھر ہونٹوں پر بوسہ دیا۔ شبانہ نہتے سپاہی کی مانند اس کے سامنے تھی۔ جمیل کی دلیری سے وہ انجان تو نہ تھی، لیکن جمیل اس کے سامنے ایسے موجود ہو گا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا، "شبانہ اگر تمہیں برا لگا ہو تو معاف کرنا۔ میں اپنے دل کے آگے بے اختیار ہوں۔" اس نے اپنے دل پر بایاں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

شبانہ کے حواس واپس آنے لگے۔ جمیل کے کندھے پر بیگ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر بھی تھا۔ اس نے شاپر شبانہ کو دیتے ہوئے کہا، "یہ لو تمہارے لیے ہے، میں سیدھا تمہارے پاس آیا ہوں۔" دکھی لہجے میں جمیل نے اس سے کہا، "مجھے تمہاری ماں کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔ گھر جا رہا ہوں ہم بعد میں ملتے ہیں۔"

وہ شبانہ کو چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ شبانہ کی یہ کیفیت اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ ایسے جیسے بچپن میں اس کی ماں نے پہلی بار گرم گرم پیڑا کھلایا تھا اور پھر وہ ہمیشہ ماں سے پیڑے کی فرمائش کرتی رہتی تھی۔ اسے جمیل کے ساتھ بھاگ جانے والی ماں کی بات بھی یاد آنے لگی۔

جمیل اس کے گھر کے دروازے سے نکلا تو اسے کئی آنکھوں نے دیکھا، ان میں سے کچھ آنکھیں پہلے سے ہی شبانہ کی طلبگار تھیں، لیکن ان کو موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ جمیل کا وہاں سے نکلنا پڑوس کے نوجوانوں کے لئے نیا موضوع تھا۔ پہلے وہ اسے پھنسانے اور باری لینے کے بارے میں باتیں کرتے تھے، جلتے، بھنتے رہتے تھے۔ اب تو ان کو جیسے تیز بہتی نہر میں اترنے کی جگہ نظر آ گئی تھی۔

☆☆☆

پوری کالونی کو خاموشی نے دھند کی طرح گھیر رکھا تھا۔ ریل کے گذر جانے کے بعد تو انتہائی گہری خاموشی چھاگئی تھی۔ رات اور خاموشی کے ملاپ سے لوگوں کا شور کمروں میں بند تھا۔

شبانہ گھر میں اکیلی تھی، آدھی رات گذرنے کے گھنٹہ ڈیڑھ بعد باپ کا انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اماوس کی رات میں بجلی جانے کے بعد اس کی نیند اور بھی گہری ہوگئی تھی۔ اس کا باپ ذکیہ کے فوت ہونے کے بعد پہلی بار گھر نہیں پہنچا تھا، ورنہ وہ نو دس بجے تک آجاتا تھا۔ نیند آنے سے پہلے شبانہ اپنے باپ کے لئے بارہ بجے تک تین دفعہ دروازے تک گئی تھی۔ آخری دفعہ جب اس نے دروازہ کھولا تو اس وقت ٹرین گذر رہی تھی، جس کی کھڑکیوں اور دروازوں سے نکلنے والی روشنی، کوارٹر کے سامنے راستے اور ریل کی پٹری کے نزدیک جھاڑیوں پر پڑتی جارہی تھی۔ اور جھاڑیوں پر ناچتی جارہی تھی۔ ریل گذرنے کے وقت اس نے دروازے سے تھوڑا دور ایک سایہ دیکھا اور ریل کے شور میں دبی ہوئی آوز بھی سنی لیکن وہ سمجھ نہ سکی۔ آخری جملہ کچھ سمجھ میں آیا، "ڈرنا نہیں" آواز سن کر وہ جلدی سے کمرے میں آگئی تھی۔

کمرے میں اس کی نظر جمیل کے دیئے ہوئے شاپر پر پڑی۔ اس نے کھولا تو اس میں ایک پرفیوم، چوڑیاں، ہیئرپن اور ایک ہار تھا۔ شبانہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ایک گھنٹے تک اس کے سارے وسوسے اور انتظار ختم ہوگئے تھے۔ اس نے چوڑیاں پہن کر دیکھیں، ہار پہن کر آئینے کے سامنے آئی اور پرفیوم بھی لگایا۔ اس نے زندگی کے نئے معنی دیکھے تھے۔ ڈیڑھ بجے تک نیند اسے پوری گرفت میں لے چکی تھی۔ گھنٹے ڈیڑھ کی گہری نیند سے جاگنے کے دوران اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لیکن اسے پھر نیند نے گھیر لیا۔ اس کی کلائی پر ہاتھ پڑا، اس نے سمجھا وہ خواب دیکھ رہی ہے۔

"شبانہ۔۔۔! او شبانہ! جاگ رہی ہو۔۔!"

شبانہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی تو تھی، لیکن بلب کی نہیں، جمیل کے ہاتھ میں ٹارچ تھا، جس کی روشنی میں جمیل کو تو شبانہ نظر آ رہی تھی لیکن شبانہ کے لئے جمیل کو پہچاننا آسان نہ تھا، کیونکہ تیز روشنی اس کی آنکھوں کو لگ رہی تھی۔ جمیل نے یہ سوچ کر کہ وہ ڈر نہ جائے اور شور نہ مچادے، اس لئے جلدی سے کہا "ڈرو نہیں میں ہوں جمیل!"

شبانہ نیند کے خمار سے بیدار ہو چکی تھی، "تم اس وقت یہاں!؟" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔

جمیل نے دھیمے آواز سے بات کرتے ہوئے کہا، "تمہیں بتایا تو تھا کہ میں دیر سے آؤں گا، ڈرنا نہیں۔"

شبانہ کا خوف ختم ہوا تو اس کے جسم کا تناؤ بھی کم ہوا۔ "ابانہ آجائے۔ تم فی الحال چلے جاؤ۔" اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

جمیل نے اطمینان سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اسے بھی اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا، "اس کی فکر نہ کرو، یا تو گلزار کے میخانے پر ٹن ہو کر سو رہا ہو گا، یا پھر راستے میں ہی کہیں نیند آگئی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟" شبانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے باپ کو شراب کی پوری بوتل دی ہے، اسے کہا کہ آپ کے لئے میری نوکری کی مٹھائی ہے۔" جمیل نے خوش ہو کر کہا، "موالی بندے کو بوتل ہاتھ لگ جائے تو وہ چھوڑے گا تو نہیں نا۔" اس نے شبانہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا، "اور ہاں تمہاری بھی مہربانی کہ دروازہ کھلا رکھا ورنہ رات کو دیوار پھلانگنا پڑتا۔"

شبانہ کو یاد آیا کہ اس نے سایہ دیکھ کر جلدی سے دروازہ بند کیا تھا لیکن کنڈی نہیں لگائی تھی۔ دونوں کے درمیان کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ لیکن ان کی دلوں کی دھڑکن دیواریں

بھی سن رہی تھیں۔ شبانہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرے۔ یہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ جمیل کا ایسے آنا اسے برا لگا ہے یا نہیں؟ ڈر گئی ہے یا نہیں؟ ابھی وہ صورتحال سمجھنے کے خیال سے دوپٹے کا کوئی کونا پکڑنے ہی والی تھی کہ اچانک بجلی آ گئی۔ کمرے میں روشنی پھیلتے ہی شبانہ یکدم جمیل کے برابر سے اٹھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے روشنی لوگوں کے ہجوم جیسی محسوس ہوئی، جن کے سامنے وہ اپنے محبوب کی طرف دیکھنے سے کترا رہی ہو۔ ایک لمحے کے لئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ اب جمیل اسے پسند آنے لگا ہے۔ اسے جمیل کی موجودگی سے کوئی خوف یا خطرہ محسوس نہیں ہوا اور جمیل اسے اپنے وجود کا حصہ لگنے لگا۔

جمیل نے مسکرا کر بات شروع کی اور اس کے خیالوں کے پل کو ڈھا دیا، "شبانہ اگر میرے یہاں ہونے پر تمہیں اعتراض ہے تو میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ لیکن شبانہ نے اس کے چہرے کے تاثرات سے سمجھ لیا تھا کہ وہ یہ سب کچھ جھوٹ موٹ کر رہا ہے۔ اب شبانہ نے ہنس کر کہا "اور اگر واقعی تم جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر کے لئے رسمی بات چیت کے بعد جمیل اسے کہنے لگا، "شبانہ مجھے یہ بات لاہور میں پتہ چلی تھی، لیکن مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا، یہاں آ کر سچ کا پتا چلا اور گلزار سے بھی تصدیق کی ہے کہ چچا رحیم داد تمہارا بیاہ اس سے کرنا چاہتا ہے۔ تمہارا سودا اسی ہزار روپے میں کیا ہے اور گلزار سے مختلف اوقات میں دس ہزار روپے بھی لے چکا ہے۔"

شبانہ کے اوپر تو جیسے تو دا گر گیا۔ "تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ گلزار باز نہیں آئے گا وہ تم سے بیاہ کرنے کے لئے پاگل سا ہو گیا ہے۔" جمیل کے لہجے میں دکھ تھا۔

"جمیل، پھر تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" شبانہ نے اتنی جلدی سے کہا جیسے کوئی برسات میں کھلے آسمان تلے پڑا سامان اندر کر رہا ہو، "مجھے یہاں سے لے چلو، جہاں کہو گے ساتھ چلوں گی۔"

جمیل نے سر جھکا دیا۔ جیسے کسی نے منوں بھاری وزن رکھ دیا ہو، "یہ ناممکن ہے۔" دبی ہوئی آواز میں بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا، "جب تک میرا باپ زندہ ہے، وہ کبھی نہیں مانے گا۔"
سر اٹھا کر شبانہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، "اور نہ ہی تمہارا باپ مانے گا۔"

"لیکن میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔" شبانہ نے بے چینی سے کہا۔ جیسے اس کے من کی محبت سینے سے نکل آئی ہو۔ اسے شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ جمیل اس کے دل میں دھڑک رہا ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جمیل نے کہا، "شبانہ، میں تمہارے پاس آیا بھی اس لئے ہوں کہ تمہیں بتا سکوں کہ میری تم سے شادی نہیں ہو سکتی۔" تھوڑے وقفے کے بعد کہنے لگا، "سچ تو یہ بھی ہے، اگر تم اور میں چاہوں تو شادی کوئی معنی نہیں رکھتی، ہمارے پیار کو کسی اور رشتے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم دونوں کی ایک دوسرے کے لئے سچائی اور محبت ہی ہمیں ہمیشہ کے لئے جوڑ کر رکھ سکتی ہے۔"

شبانہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، جس میں درد بھی تھا اور طنز بھی، "کہنے کو تو یہ باتیں خوبصورت ہیں، لیکن دو وجود شادی کی گرہ سے ہی ہمیشہ کے لیے باندھ کر رکھے جا سکتے ہیں۔" جمیل نے محسوس کر لیا کہ اب شبانہ چنچل لڑکی نہیں رہی بلکہ سمجھدار عورت کی طرح بول رہی ہے۔ شبانہ اسے مزید حیران کرتے ہوئے بولی، "ایک گرہ شادی ہے اور دوسری اولاد۔ جس رسی کو یہ دو گرہیں لگیں اسے ہی پیار کی رسی کہتے ہیں، تم بتاؤ پھر یہ رسی ٹوٹ سکتی ہے؟"

جمیل کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ شبانہ کی عقلمندانہ باتوں نے دونوں کے درمیاں اجنبیت کی دیوار کھڑی کر دی۔ لیکن جب دونوں ساتھ میں چارپائی پر بیٹھے تو ان کے من میں ٹرین کے آنے کی گھنٹی بجنے لگی اور ریڈ سگنل روشن ہو گئے۔ وہ دونوں ایک وجود والے منظر میں گم ہو گئے۔

جب جمیل وہاں سے چلا گیا تو شبانہ نے اس رات بھی سرخ خواب دیکھے اور خوابوں میں سرخ آسماں۔ وہی خواب جو پہلی ماہواری کے دوران دیکھا تھا۔ شبانہ کی زندگی اب بالکل کروٹ لے چکی تھی۔ اس نے اپنے بدن میں تبدیلی محسوس کی۔ ڈر اور خوف کو دھکیل دیا۔ پچھتاوے کے خیالات کو اپنی سوچ کا حصہ نہیں بننے دیا۔

اگلی صبح اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو بالکل بھی نہیں روکے گی۔ اس کا باپ کیا چاہتا ہے، کیا نہیں چاہتا، وہ کسی بھی طرح راستہ نہیں روکے گی۔ اس نے ایسا کیوں سوچا اور کیوں طے کر لیا؟ اس کے پاس، اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ یہ سوچ اس کے ذہن پر مہر کی طرح لگ گئی، لیکن جو بات اسے ستا رہی تھی وہ جمیل تھا جسے جانا تو تھا لیکن اس کی ذات شبانہ کے لئے الجھے ہوئے دھاگوں کی طرح تھی۔

☆☆☆

جمیل چار دن رکا تھا اور اس کی چاروں راتیں شبانہ کے ساتھ گذریں تھیں۔ رحیم داد ان چار دنوں میں شام کو ایک دو بار آیا۔ شبانہ کو کھانے پینے کی کچھ اشیا دیکر گلزار کی جگہ پر پڑا رہتا تھا، جو اب موالیوں کا مستقل ٹھکانہ بن چکا تھا۔

جس رات جمیل نے شبانہ کو بتایا کہ وہ کل لاہور جا رہا ہے اور ٹریننگ مکمل ہونے پر اسے کہیں نہ کہیں اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر مقرر کرینگے، اس وقت شبانہ کو لگا کہ جمیل اس کی عادت بن گیا ہے اور وہ اس سے الگ ہو کر نہیں رہ سکتی۔ اس کے ساتھ بتائی راتیں ایک پل جیسی محسوس ہونے لگیں۔ جمیل کا جانا اس کے لئے صدیوں کی دوری کا احساس پیدا کر رہا تھا۔ الوداع کہنے کے لئے دونوں انہی مال گاڑیوں کے پاس بیٹھے تھے جہاں جمیل نے پہلی بار لاہور جانے کے لئے الوداع کیا

تھا۔ آہستہ آہستہ شام پر رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دونوں کو وہاں سے بھگانے کے لئے مچھروں نے بھی خوب کارروائی کی لیکن روح کو لہو میں نہاتا دیکھ کر اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخنوں سے پاؤں، کانوں، ہاتھوں اور گردن کو کھجا کھجا کر جو خون نکال رہے تھے، اس کا انہیں کوئی احساس نہ تھا، نہ ہی وہ کسی آواز پر چونک رہے تھے۔ انہیں کتوں کے بھونکنے سے بھی کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ نہ ہی وہ کسی کے آجانے کے ڈر سے پریشان تھے۔ جمیل کی نسبت شبانہ اس خوف سے کانپ رہی تھی کہ وہ اب اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کہ جارہا ہے۔ شبانہ بار بار جمیل سے چمٹ کر لاہور جانے سے روکنے کے جتن کرتی رہی۔ "چاہے تم مجھ سے شادی نہ کرو، لیکن مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔" اس نے ایک طرح سے جمیل کو لالچ دیتے ہوئے کہا، "چاہے تم دو دو شادیاں کرو اور دوستیاں الگ بناؤ، لیکن مجھے الگ مت کرو۔" جمیل کے خاموش رہنے پر اس کے سینے پر مکے مار کر کہنے لگی، "کیسے پتھر کے انسان ہو جو سمجھ ہی نہیں رہے ہو!"

جمیل صرف کنکریاں اٹھا اٹھا کر دور پھینکتا رہا۔ دونوں کے درمیاں خاموشی کے بند کو تیسری دفعہ بھی شبانہ نے ہی توڑا، "میرے جیون میں نئی زندگی کی جو ابتدا تم نے کی ہے میں چاہتی ہوں اس کی انتہا بھی تم کرو۔" اس کی جتنی سوچ تھی اس کے مطابق اس نے جو باتیں کرنی تھی کردیں لیکن پھر بھی وہ جمیل کو روک نہ سکی۔ جمیل کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا جو شبانہ کے لئے اطمیناں کا باعث ہو، اور اسے یقین دلائے۔ وہ جمیل کی آنکھوں، لہجے اور چہرے کے تاثرات سے یہ اندازہ تو کر رہی تھی کہ وہ جمیل کے لئے کوئی معنی تو ضرور رکھتی ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ وہ اس کے لئے جو کچھ بھی ہے، فقط انہی لمحوں تک ہے جو ساتھ بتا رہے ہیں یا آنے والے وقت میں بھی وہ جمیل کے لئے ویسی ہی رہے گی۔ جمیل بار بار گھما پھرا کر دو جملے کہہ رہا تھا، "تمہارا اور میرا یہ ملن، یہ ملاقاتیں، ہماری زندگی کا خزانہ ہے۔ یہ خزانہ نہ تم خرچ کر سکتی ہو نہ میں۔"

رات ہونے کا اعلان آس پاس میں روشن ہونے والے بلبوں اور اسٹریٹ لائینس کی روشنی نے کیا۔ ٹھنڈ بڑھنے کی وجہ سے مچھر واپس جاتے ہوئے بھی دونوں کے جسموں میں باریک سویاں چبھوتے گئے۔ شبانہ کو تو ہر گذرنے والا لمحہ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح میں بھی سویاں چبھ رہی ہوں۔

آخر جمیل کو اٹھنا پڑا، اسے جانا تھا۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کے نچلے حصے میں پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ اس نے بیڑیوں سے بندھے قیدی کی طرح ریل کی پٹریاں پار کیں، لیکن جھاڑیوں سے گذرتے راستے پر پہنچ کر رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن شبانہ وہاں موجود نہ تھی۔ وہ تیزی سے پٹریاں پار کر کے گھر پہنچ چکی تھی۔ شبانہ دوسری مرتبہ ایسی اذیت ناک کیفیت سے گذر رہی تھی۔ وہ ماں کی گمشدگی کے بعد بھی عذاب کی پلصراط پر چلی تھی، وہی صدمہ اس وقت بھی محسوس کر رہی تھی لیکن شاید اس بار کی کیفیت اور بھی شدید تھی۔ اس کا من گھائل ہو رہا تھا۔

وہ جب بڑی ہو رہی تھی تو بظاہر جمیل اسے زیادہ پسند نہیں تھا۔ اسے بہت دیر سے معلوم ہوا کہ پیار اس غنچے کی طرح تھا جو درخت کے سخت تنے کے اندر چھپا ہوا تھا۔ جوانی کی بہار آئی تو غنچہ نکل آیا۔ اس غنچے سے پھول بن کر جمیل نکلے گا، یہ احساس شبانہ کو اس وقت ہوا جب اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ جمیل کے ساتھ بھاگ جائے۔ لیکن ان چار دنوں میں اسے یقین ہو گیا تھا۔ جمیل اس کی ایسی عادت بن گیا تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار دھرائی جائے۔

وہ جانتی تھی کہ جمیل کو رات بارہ بجے والی ٹرین سے جانا ہے۔ یہ بے خودی بھی بالکل ایسی ہی نئی تھی، جیسے اسے جمیل کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کے خیالوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے اٹھی اور ہوا کی طرح اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئی۔ درختوں والے راستے سے شارٹ کٹ کر کے اسٹیشن کے ساتھ پہاڑی پر بنی انگریزوں کے دور کی دومنزلہ انتظار گاہ کے پاس

پہنچی۔ یہ انتظار گاہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہاں سے وہ برج پر آئی۔ اس کی نظروں کو جمیل کو ڈھونڈنے کے لئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس کی نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں لوگوں کے ہجوم کے درمیان اُسے ایسے ڈھونڈ لیا جیسے اس کی بے خودی اس کی سوچ کی سب دیواریں پھلانگ کر ایک لمحے میں اسے یہاں لے آئی تھی۔ جمیل پلیٹ فارم نمبر ۳ پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا لفنگا دوست سہیل تھا، جو بچپن سے ہی اسے تاڑ تا رہا تھا، لیکن قریب آنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

اس نے برج سے ہی دیکھ لیا کہ جمیل چین سے نہیں ہے۔ وہ سہیل کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ ٹرین رکی ہوئی تھی، جمیل سامان بھی بوگی میں رکھ چکا تھا۔ شبانہ نے دیکھا کہ جمیل پلیٹ فارم کی دونوں اطراف دیکھ رہا تھا۔ وہ انتظار کی کیفیت میں تھا۔ شبانہ سمجھ گئی کہ وہ اسے ہی تلاش کر رہا ہے۔ وسل بجنے میں تھوڑی دیر رہ گئی تھی۔ شبانہ سیڑھیاں اتر کر پلیٹ فارم نمبر ۳ پر آئی، جمیل نے جیسے ہی اُسے دیکھا اس کا چہرہ کھل اٹھا اور سہیل کو وہیں چھوڑ کر تیز قدم بھرتے ہوئے شبانہ کے پاس پہنچا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، لیکن لوکو شیڈ کالونی میں بسنے والے کلاس فور کے کچھ ملازموں کی آنکھوں نے بھی دونوں کو بات کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان میں بکس پورٹر مجید، اس کے کوارٹر والی لائن میں رہنے والا سیفل اور کیبن مین قدرت اللہ شامل تھے۔ قدرت اللہ نے تو ذکیہ کے لئے بڑے جتن کئے تھے لیکن اس کا بس نہ چلا۔ سیفل اور مجید پینتیس اور اٹھتیس برس کے ہونگے، وہ شبانہ کو پھنسانے کے لئے کئی بار خیالی پلاؤ کی دیگیں پکا چکے تھے۔ اسپیکر پر ٹرین کے جانے کا اعلان ہوا۔

"شبانہ کوشش کروں گا کہ تین ماہ بعد چھٹی ملے تو میں یہاں آ جاؤں۔" جمیل نے اداس ہو کر کہا۔ "وقت کے کھیل ہیں، دیکھتے ہیں کہ وقت ہمارے ساتھ کہاں تک کھیلتا ہے یا ہم وقت کے ساتھ۔۔۔ شبانہ، تم خواہ مخواہ میری خاطر خود کو اذیتیں نہیں دینا، زندگی کو زندگی کی طرح جینا۔"

ٹرین کے انجن کی پہلی 'چھک' پر سہیل کی آواز آئی، ''جمیل ۔ چھوڑ دو اس کا پیچھا۔ ٹرین پکڑو۔"

شبانہ نے محسوس کر لیا کہ سہیل کے لہجے میں تیز دوڑتی ٹرین کی "چھک چھک " تھی، اس نے سہیل کی آواز میں حسد اور کینہ بھی محسوس کیا۔ جمیل ٹرین میں سوار ہو کر چلا گیا۔ جدا ہونے والے لمحے کے دوران دونوں ایک دوسرے کو دیکھ نہ پائے۔

☆☆☆

دل میں خاموش درد، ہونٹوں پے مسکان، آنکھوں میں بنا کاجل کے کاجل، ہوا کی چھیڑ چھاڑ کے لئے کھلے ہوئے بال اور چال میں بے پرواہی، شبانہ سارے محلے کے لئے پھولوں اور پھلوں والا درخت بن گئی۔ جمیل کے جانے کے بعد اس کے لئے ریل کی پٹریوں کے پاس کھڑے رہنے کے دو اسباب تھے، ایک ماں کا انتظار، دوسرا جمیل کا، جو شاید انتظار تھا بھی اور نہیں بھی۔

وہ رفعت ہی تھی جس نے ڈیڑھ ماہ بعد شبانہ کی حالت دیکھ لی اور اپنے پاس بٹھا کر پوچھا، "پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہ پاپ پالنا چاہتی ہو یا نہیں!؟"

شبانہ حیران ہو گئی، اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ رفعت نے اسکی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا، "یہ سب جمیل کا کیا دھرا ہے نہ اسی نے تمہاری آبرو خاک میں ملا دی؟"

شبانہ نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاک کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے بچپن سے ہی مٹی گوندھ کر اس سے کھلونے بنانا اچھا لگتا تھا۔ مٹی پتلی ہو جاتی تھی تو اس میں مٹھی بھر خاک ملا دیتی تھی۔ موسم گرما میں تو اس نے مٹی کے کئی کھلونے بنا کر توڑ دیئے تھے۔ اس کے خیالوں کو توڑتے ہوئے رفعت نے دوبارہ پوچھا، "شبانہ بتاؤ، اگر دیر ہو گئی تو سب کو پتا لگ جائے گا، پیٹ موت کی

طرح چھپ نہیں سکتا۔"

"ل۔۔ لیکن۔۔۔ کیسے؟" شبانہ نے بات کو سمجھتے ہوئے رک رک کر کہا۔

"آسان کام ہے۔" رفعت نے آس پاس دیکھ کر جائزہ لیا کہ کوئی دیکھ یا سن تو نہیں رہا، "نرس سے، میری جاننے والی ہے اور بھروسے والی بھی ہے۔"

رفعت کافی دیر تک اسے سمجھاتی رہی۔ شبانہ اس کی باتوں سے قائل ہوگئی۔ اسے کوئی اور حل سمجھ نہیں آرہا تھا۔

رفعت جہاں دیدہ خاتون تھی۔ اس نے ڈیڑھ ماہ بعد شبانہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ بکس پورٹر مجید کو اپنے پاس آنے دے گی۔ مجید نے رفعت کو دو ۔ روپے دیئے اور شبانہ کے پاس اگلی رات کو ایک سو روپے چھوڑ کر چلا گیا۔ سہیل نے بھی مجید کو دوراتیں کوارٹر میں آتے جاتے دیکھ لیا تھا۔

اسے پتا تھا کہ مجید کی بیوی تین ماہ سے روٹھ کر چلی گئی ہے اور یہ کہ مجید اس معاملے میں زیادہ مشہور بھی تھا۔ مجید کی بیوی اس لئے گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی کہ اسے شوہر نے قدرت اللہ کے ساتھ "دیکھ" لیا تھا۔ مجید کی بیوی اتنی تیز اور چالاک عورت تھی کہ سارا محلہ سر پر اٹھالیا، باہر نکل کر شوہر کو گالیاں دیں اسے یہ کہہ کر رسوا کرتی رہی کہ وہ اس پر غیر مرد کے ساتھ سونے کا جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ اس نے ان الزامات کا سبب یہ بتایا کہ اس کے شوہر مجید میں مردانگی ہی نہیں رہی، اس لئے وہ ایسے الزام لگا رہا ہے۔ مجید ایک ماہ تک منہ چھپاتا رہا اور اس کی بیوی روٹھ کر اپنے میکے ہالا چلی گئی۔ سہیل کو یہ بھی معلوم تھا کہ قدرت اللہ اس دوران دو بار چھٹی لے کر ہالا بھی گیا تھا۔

مجید کے جانے کے بعد سہیل نے دو مرتبہ شبانہ کے گھر کے دروازے پر دستک دینے کی کوشش کی، لیکن وہ ہمت نہ کر سکا۔ مجید کے شبانہ کے گھر آنے والی بات بھی زیادہ دیر نہ چھپ سکی۔ کچھ گھروں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس گلی میں گھومنے والوں اور دکانداروں کو معلوم

ہو گیا۔ سہیل کو ایک دوست نے بات اتنی بڑھا چڑھا کر بتائی کہ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سہیل ہفتہ بھر مزدوری کر کے تین سو روپے مشکل سے کما سکتا تھا جس میں سے دو سو روپے اسے گھر میں دینے ہوتے تھے۔

گرمیوں کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ وہ پیپل کے پتوں پر پاؤں رکھ کر روڈ پر چلتی سنبل کے ہاں جا رہی تھی۔ اچانک ایک درخت کے پیچھے سے سہیل اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لئے اسے لگا، جیسے جمیل اس کے سامنے آکر کھڑا ہوا ہو۔ اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں میں بجلی چمک گئی، لیکن وہ بجلی اسی کے دل پہ جا کر گری۔ سہمے سے سہیل نے ہمت باندھ کر اس سے کہا، "مجھ سے دوستی کرو گی؟"

شبانہ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی، گندمی رنگت اور اچھا بھلا دکھنے والا نوجوان تھا۔ فلمی اداکاروں جیسا ہیئر اسٹائل، لال رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر تیل کے دو داغ تھے۔ شبانہ اس کی حالت دیکھ کر مسکرا دی، "چھورے! تم کرتے کیا ہو؟"

"جمیل کی طرح تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔" اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے سہیل نے کچھ مزید ہمت باندھ کر اپنی بات کہہ ڈالی۔

شبانہ نے قہقہہ لگایا۔ نہ فقط قہقہہ، لیکن اس دن اس کی مزاج کے پیڑ سے بھی بے تکلفی کے پتے جھڑنے لگے تھے۔ جس پر بعد میں وہ خود بھی حیران ہوئی تھی۔ اس کے ذہن پر شمال سے آئے ہوئے بادل چھا جاتے تھے اور وہ گہری پریشانی میں جکڑ جاتی تھی۔ شمال کے بادلوں کے لئے یہ بے تکلفی جنوب کی ہوا ثابت ہوئی۔

اس نے شرارتی انداز میں اس سے پوچھا، "جمیل کی طرح کیوں آنا چاہتے ہو؟"

"جمیل تمہارے پاس کیوں آتا تھا؟" سہیل نے الٹا اس سے سوال کیا۔

شبانہ نے پھر بڑا قہقہہ لگا کر سہیل کے سینے پر مکا مارتے ہوئے کہا، "چھورے، تم واقعی

بڑے حرامی ہو۔"

شبانہ یہ کہہ کر وہاں سے سنبل کے گھر چلی گئی۔ پیچھے سہیل کافی دیر تک اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا رہا۔

شبانہ نے اپنے اندر ایسا انداز محسوس کیا تو اس نے اس انداز کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس دن کے بعد شبانہ کی زندگی میں بے تکلفی والا انداز بھی ایک نئی عادت کی طرح شامل ہو گیا۔ جب وہ سنبل کے ہاں پہنچی تو اس نے سہیلی کے ساتھ بھی ایسی ہی بے تکلفی اور نچلے درجے کی گالیوں کا استعمال شروع کر دیا۔ شبانہ نے اپنے اندر، ایسی بے تکلفی کی وجہ سے بے خوفی کے درخت کو بھی بڑھتا ہوا محسوس کیا۔

سنبل نے اس سے سوال کیا، "میرا ایک کام کرو گی؟"

وہ زیادہ سوچ بچار کرنے کے بجائے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگی، "حکم کرو، تمہارا کام نہیں کروں گی تو پھر کس کا کروں گی۔ کنویں میں چھلانگ لگانے کیلئے کہو گی تو وہ بھی کروں گی۔"

"میرا ایک دوست ہے، اس کا دباؤ ہے کہ میں اس کے دوست کی کسی لڑکی سے دوستی کراؤں۔" سنبل نے شبانہ کے چہرے پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے یہ بات کہی اور شبانہ کے چہرے سے بے تکلفی والی چادر کھسکتی بھی محسوس کی۔ "تم میری بات سمجھ رہی ہو یا نہیں؟"

شبانہ نے چند ہی لمحوں میں اپنی حیرانی پر قابو پا لیا اور خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، "کیوں وہ لڑکا بالکل بھی اناڑی ہے کیا؟ حرامی خود کسی سے دوستی نہیں کر سکتا کیا؟ سچ تو یہ ہے مجھے ایسے ڈرپوک مرد یا لڑکے بالکل اچھے نہیں لگتے۔" شبانہ نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"یار تم میری خاطر کچھ مہربانی کر دو، عرفان ناراض ہو گیا تو سمجھ لو میں دو سال پیچھے رہ جاؤں گی، وہ میرے لئے بہت خرچہ کرتا ہے، میری ہر ضرورت کے وقت کام آتا ہے۔" سنبل نے ہاتھ جوڑ کر شبانہ کی منت کرتے ہوئے کہا۔

شبانہ مسکرا دی اور کچھ کہے بنا گردن ہلا کر حامی بھر لی۔

☆☆☆

شبانہ کو اس کے باپ نے الٹیمیٹم دے دیا تھا کہ وہ جون کے مہینے میں اس کی شادی گلزار سے کر دے گا۔ جب شبانہ کو ماں کی زندگی میں ہی اس بات کا پتہ چلا تھا، تب اس نے اس بارے میں بہت سوچ بچار کی تھی۔ ذکیہ کی وفات کے بعد اس کے ساتھ جو بھی واقعات پیش آئے، ان کی وجہ سے اس نے اپنے لئے راستے تنگ ہوتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ اس لئے شبانہ کے لئے یہ کوئی نئی یا خوف میں مبتلا کر دینے والی بات نہیں تھی۔ اس نے بہت سوچا تھا لیکن اسے کوئی حل سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر قبول کر چکی تھی کہ گلزار سے شادی کر لے گی۔ اس نے گلزار کو دیکھا تھا جو اب گندم کی اس بوری کی طرح تھا جو بندھی ہوئی تو منہ تک تھی لیکن اس میں گندم آٹھ دس کلو بمشکل ہو گی۔ اس نے سوچا کہ اس کمزور اور لڑکھڑاتے انسان کے ساتھ رہنے میں حرج ہی کیا ہے، وہ اس کی زندگی میں زیادہ روک ٹوک اور مداخلت نہیں کرے گا۔ یہ شبانہ کی سوچ تھی۔ آنے والا وقت اس کے لئے کیا لے کر آئے گا اس سے کائنات کے ہر انسان کی طرح وہ بھی بے خبر تھی۔ جس دن رحیم داد نے اس سے یہ بات کی تھی تو اس نے باپ کو بھی ایک ہی جملہ کہا تھا، "جب چاہیں یہ طوق میرے گلے میں ڈال دیں۔" یہ کہہ کر وہ ریل کی پٹریوں کی طرف چلی گئی تھی اور کافی دیر ریل کی پٹریوں کو گھورتی رہی تھی۔

اس دن شام کو سنبل اس کے پاس آئی اور اسے کہا، "عرفان اور اس کا دوست آج اسٹیشن پر آئیں گے، تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

شبانہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئی، لیکن سوچ میں کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ اس کی سوچ

خالی خالی تھی اس لئے اس نے خالی لہجے کے ساتھ سنبل کو ہاں کر دی۔

ویسے بھی اس کے لئے اب ایک کمرے والا وہ مختصر گھر کیا تھا؟ جس میں وہ فقط کھانا پکاتی تھی، کبھی باپ کا انتظار کرتی تھی تو کبھی نہیں۔ اس نے تو اپنے متعلق ہونے والی باتوں کو ٹرین کی 'چھک چھک' والی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایسی باتوں سے لاتعلق رہی اور ان کے اوپر قطع نظری والی ٹرین چڑھا کر گذر جاتی تھی۔

لوکوشیڈ والے علاقے میں گذشتہ تین برسوں کے دوران ریلوے ملازمین کے علاوہ دوسرے لوگوں کی آبادی بھی بڑھنے لگی تھی۔ زمینوں پر قبضے بھی شروع ہوگئے تھے، آبادی ایسے بڑھتی جائے گی، وہاں کے مکینوں کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑھتی آبادی اور تجاوزات ایسی تھیں، جیسے بلوغت سے جوانی تک پہنچنے تک کا پتہ ہی نہ چلا ہو۔ جب شبانہ چھوٹی بچی تھی تو اس کا معصوم اور بچکانہ جسم فضا میں چھوٹا حصہ ہی گھیرتا تھا اور جوانی آئی تو بڑھتے ہوئے جسم نے فضا میں زیادہ حصہ گھیر لیا۔ اسے نہ جانتے ہوئے بھی یہ معلوم تھا کہ یہ قبضہ ختم ہونے والا اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ اسے یہ پختہ احساس کافی دنوں بعد ہوا تھا۔ ملازمین کے مابین ان تجاوزات کے بارے میں بات چیت ہوتی رہتی تھی اور ہر کوئی کہتا تھا ہمارا کیا؟ ہر شہر میں ہونے والے قبضوں کی مثالیں بھی دیتے اور آخر میں انتظامیہ کو برا بھلا کہہ کر اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کر لیتے تھے۔

شبانہ اور سنبل اسٹیشن پر پہنچیں تو تقریباً سارے پلیٹ فارم لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہوا ابھی چلنا شروع ہوگئی تھی اس لئے اسٹیشن پر تیار ہونے والے کھانوں کی خوشبو ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ اسٹیشن پر دھواں بھی تھا۔ مختلف آوازوں اور لوگوں کی رش سے گذر کر دونوں ایک پی سی او کے پاس پہنچیں۔ ٹیلفون کے بعد وہ پیلے رنگ کے کارڈ والے پی سی او ابھی نئے نئے شروع ہوئے تھے۔ دونوں بتائی ہوئی نشانی کے پاس پہنچیں تو چائے اور کولڈ ڈرنک والے اسپاٹ سے دو

آدمی ان کی طرف بڑھ کر آئے۔ ایک دوسرے سے علیک سلیک کی۔ سنبل نے عرفان سے شبانہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا، "یہ شبانہ ہے میری دوست۔"

عرفان نے اس کا درزی کی آنکھ کی طرح جائزہ لیا۔ شبانہ نے سرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سادہ لان کے کپڑوں اور گلے میں دوپٹے سے وہ بھارہی تھی، اس کی غربت اس کے سامنے شرمندہ تھی۔ ایک لمحے کے لئے عرفان نے سنبل کی طرف دیکھا جس کے گال شبانہ کی نسبت گوشت سے خالی تھے۔ شبانہ کا گول چہرہ اور بڑی ٹھوڑی اور سارس جیسی گردن۔ عرفان نے اپنا سر کھجاتے ہوئے اپنے دوست کو دیکھ کر کہا، "بس یار نصیبوں والے ہو، لیکن اگر سودا کرو ---"

سنبل نے غصے سے عرفان کی طرف دیکھا کیونکہ وہ بات سمجھ گئی تھی اور یکدم سے اسے کہا، "بس بس کمینے نہ بنو، اب چلنا چاہیئے۔"

عرفان نے اسے بوتل پینے کے لئے کہا، لیکن سنبل اب ایک منٹ بھی ساتھ کھڑے رہنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس کے دل میں خوف اور حسد جاگ گئے تھے۔ حکم صادر کرتے ہوئے شبانہ سے کہا، "تم دونوں جاؤ۔"

شبانہ مسکرادی۔ وہ عرفان کے دوست کو ساتھ لیکر اسٹیشن کی انتظار گاہ کے پاس پہنچی، اچانک اسے خیال آیا اور اس سے پوچھا، "چلنا کہاں ہے؟"

اس نوجوان نے سہمے ہوئے جواب دیا، "تمہارے ہاں جانا ہے۔"

شبانہ کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا، لیکن اس نے خود پر ضبط کر لیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر، اسے انگلی سے پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ حالات نے شبانہ کی انگلی پکڑ لی تھی تو وہ بھی بنا کچھ سوچے سمجھے وقت کے ایسے راستے پر چلنے لگی جو اس کے لئے بدنصیبی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی کی بدنصیبی پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی، لیکن پھر بھی

کبھی کبھی اسے خود پر غصہ آتا تھا۔ اسے یہ غصہ شادی کے بعد ہوا تھا، یوں کہیے، اندر کی آندھ ماندھ کو اس نے کافی دیر بعد پہچانا، کہ وہ غصہ خود پہ تھا۔

عرفان کا دوست اس کے ساتھ ایسے چلتا رہا جیسے وہ کسی بکری کو ساتھ لے کر جا رہی ہے۔ رات بھی ہو چکی تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد نوجوان کو کمرے میں بٹھا کر وہ صحن میں نکل آئی۔ آسماں کی طرف دیکھا، ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے اس نوجوان سے نام ہی نہیں پوچھا تھا، یہ یاد آتے ہی وہ کمرے میں اس کے پاس آئی۔ وہ ابھی کچی عمر کا تھا، بمشکل سترہ یا اٹھارہ برس عمر ہو گی۔ شبانہ اس سے بے تکلفی والے انداز سے بات کرنے لگی اور اس کے برابر میں بیٹھ گئی، "چھورے یہ تو بتاؤ، پہلے کبھی۔۔۔" شبانہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر آنکھ ماری اور جان بوجھ کر اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ بیچارہ پہلے ہی ڈرا اڈرا سا بیٹھا تھا، شبانہ کے اس انداز سے مزید سہم گیا۔ وہ اس کی ایسی حالت دیکھ کر ہنسنے لگی، "پانی پیو گے؟" یہ کہہ کر اٹھی اور اس کے لئے پانی لینے باہر آ گئی۔

بر آمدے کے کونے میں مٹکے سے اسٹیل کے گلاس میں پانی بھرا، اس نے گلاس کو دیکھا، اس میں کافی ڈینٹ پڑ چکے تھے۔ اسے لگا کہ اس کے ہاتھ میں گلزار ہے اور اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے وہ نوجوان تیزی سے کمرے سے باہر نکلا، شبانہ کو لگا جیسے کوئی کبوتر دریچے سے پھڑا پھڑا کر باہر نکل گیا ہو۔ اس نے نوجوان کی آخری جھلک باہر والے دروازے کے پاس دیکھی۔ وہ گلاس لے کر کمرے میں آئی، ایک سانس میں پانی پی لیا۔

اس نے اپنی زندگی کی تاریکیوں پر سوچنا شروع کیا تو بجلی چلی گئی، کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں جمیل کا چہرہ شبانہ کے ذہن پر چمکنے لگا، اس کا دل، اس کا اندر روشن ہو گیا۔ یہ محبت اس کے لئے دور آسمانوں سے روشنی لے کر آئی تھی۔ اسے جمیل کے لاہور سے واپس آنے سے پہلے والے دن یاد آنے لگے، زندگی سے بھرپور۔ اب اسے اپنی اور ماں کی قسمت کا

موازنہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کیا جمیل لاہور سے واپس آکر اس کی زندگی میں اندھیرا کر گیا؟ یہ سوال اسے ہمیشہ تنگ کرتا تھا۔ اس دن تو شدت کے ساتھ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھر آیا تھا۔ اندھیرے میں روشن دنوں کو یاد کرتی رہی اور بجلی آئی تو اسے اپنے اندر میں گہرا اندھیرا محسوس ہونے لگا۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بھی اٹھنے لگے کہ کیا ایک وجود کسی ایک کے پاس محدود رہ سکتا ہے؟ کیا فقط روح ہی دوسری روح سے ملی ہوتی ہے؟ آخر ہستی کئی ہستیوں میں کیوں بٹ جاتی ہے؟ اسے حیرانی بھی ہوتی تھی کہ اسے اس قسم کے خیالات کیوں آتے ہیں؟ اتنا تو وہ بھی سمجھنے لگی تھی کہ تنہائی ایسی ماں ہے جو ایک ہی وقت میں مختلف خیالات کو جنم دیتی رہتی ہے۔

☆☆☆

مئی شروع ہوتے ہی دن شدید گرم ہونے لگے تھے اور رات ابھی بھی رحمدل بنی ہوئی تھی۔ کچھ برسوں سے روہڑی کے پہاڑی سلسلوں میں تو اپریل کے دوران ہی گرمی لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتی تھی، اس دفعہ دس پندرہ دن کا وقفہ آیا تھا۔

دن میں سورج مشقت والے کاموں کا جائزہ لے کر، زمین کے اس حصے کو رات کی خاموشی کی طرف جانے کا سندیسہ دے کر، اچانک مغرب میں ڈوب کر گم ہو گیا۔ اس لمحے شبانہ نے ٹرین کی پٹری کی طرف جانے کے لئے جیسے ہی دروازے سے ایک پاؤں باہر کیا، سامنے شیشم کے پیڑ کو ٹیک لگائے سہیل پر اس کی نظر پڑی۔ پہلے تو وہ چونک گئی، کیونکہ اسے لگا جمیل کھڑا ہے۔ جمیل کے خیال نے اس کے دل میں اداسی انڈیل دی۔ سہیل اسے دیکھ کر خوش ہوا، لیکن شبانہ نے سمجھا کہ وہ بھی شاید اداس کھڑا ہے۔ روڈ کراس کر کے جھاڑیوں کے درمیان بنے ہوئے راستے کی

جانب بڑھی۔ اچانک کسی خیال سے رک گئی، پیچھے مڑ کر دیکھا تو چند قدموں کی دوری پر سہیل کھڑا تھا۔ سہیل کے پیچھے اس کا گھر بھی تھا، اس کے خیالات پر دھندلاہٹ چھا گئی، اداس نوجوان کے پیچھے اداس گھر، جس کے ایک کمرے، چھوٹے سے برآمدے اور صحن کو خاموشی کے حوالے کر کے وہ ریل کی پٹری کی جانب اپنی تنہایاں بانٹنے نکلی تھی اور راستے میں اس کا سامنا ایک تنہا نوجوان سے ہو گیا۔ وہ کچھ قدم چل کر اس کے پاس آئی۔ سہیل کے ہونٹوں پر جنبش ہوئی لیکن الفاظ باہر نہیں آئے۔ شبانہ کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اس کے لبوں میں کون سے الفاظ پھنس گئے ہیں۔ وہ جس راہ پر چل رہی تھی، ایسی راہوں پر، اپنی خواہش یا دوسروں کی مرضی سے چل نکلنے والی نوجوان لڑکیوں کے لئے کسی نوجوان کی کوئی بھی طلب سمجھنا مشکل اور گہری سوچ بچار کا کام نہیں ہوتا، اس لئے شبانہ سہیل کی بے چینی سمجھ گئی اور اپنے اس خیال کو رد کیا کہ سہیل وہاں اداس کھڑا ہے۔ اسے لگا کہ سہیل اس کے سامنے اپنی بہادری ثابت کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ شبانہ جانتی تھی کہ وہ محبت میں پہل کرنے والوں کو پسند کرتی ہے، یہی وجہ تھی کہ اس نے جمیل کی محبت کو گہرا کنواں سمجھتے ہوئے بھی اس میں چھلانگ لگا دی تھی۔

"اگر تم کہو تو میں تمہارے ساتھ بھاگ کر شادی کرنے کے لئے تیار ہوں۔" سہیل کا یہ پہلا جملہ تھا جس میں بھرپور اعتماد تھا۔

شبانہ اس کے قریب آئی، "اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ایسے جھانسے کسی اور کو جا کر دو۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔ سہیل چونک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ شاید شبانہ کو اس کی بات پسند نہیں آئی اور اس کے خیالات جیسے سوکھی جھاڑیاں ہوں جن کے اوپر بپھرا ہوا سانڈ دوڑ رہا ہے۔ جھاڑیاں روندنا ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ اس کی نظر سامنے کھڑی شبانہ کی چمکتی آنکھوں پر پڑی، "تم جیسی کوئی ملے تو اسے جھانسہ دوں۔" سہیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

شبانہ نے بھویں چڑھا کر اسے دیکھا، "صاف صاف بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ تم جانتے نہیں کہ

اگلے ماہ گلزار کے ساتھ میری شادی طے ہو چکی ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں۔"

"پھر بھی تم۔۔۔" وہ اسے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے چپ ہو گئی۔

جتنی عورت کی آنکھ گہری ہوتی ہے اتنی ہی مرد کی چالاکی بھی پرانے کنویں جیسی ہوتی ہے۔ شبانہ نے سہیل کی خواہش کو تو بھانپ لیا تھا، لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکی کہ اس کی زندگی میں ایک اور المیے کا اضافہ ہونے جارہا ہے۔

دو دن بعد دونوں لوکوشیڈ کی اس اداس عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھے تھے، جسے لوگ "ناچ گھر" کہتے تھے، وہ ناچ گھر بیسویں صدی میں انگریز سرکار کے دور میں بنا تھا، در حقیقت وہ ایسا ڈانس کلب تھا، جس میں دفتر بھی تھے، لائبریری بھی تھی اور تھیٹر بھی تھا۔ ایک ہال ناچ کے لئے بھی تھا، جہاں انگریز افسران اپنی پیاریوں کے ساتھ ناچتے تھے، فلمیں دیکھتے تھے اور لائبریری میں کتابیں پڑھتے تھے۔ انگریزوں کے بعد یہ کلب آہستہ آہستہ ویران ہوتا گیا۔ ناچ گھر لوگوں کے لئے انوکھی بات تھی، اس لئے وہ پورا کلب ناچ گھر کے طور پر لوگوں کے ذہنوں میں بس گیا، جو آہستہ آہستہ ویران ہونے کے بعد اب کھنڈر ہو گیا تھا۔ چھپ چھپ کر ملنے والوں کے لئے اس کی دیواریں میٹنگ پوائنٹ بن گئیں تھیں۔ لوگوں نے عمارت کی بربادی میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ جس وقت سہیل اور شبانہ ناچ گھر والے حصے میں ایک چبوترے پر بیٹھے تھے، اس سے ایک گھنٹہ پہلے دو بندے تھیٹر کی چھت میں لگے لوہے کے آخری دو ٹی آئرن بھی نکال کرلے گئے تھے۔ ناچ گھر کی آدھی چھت موجود تھی، لیکن اس پوری عمارت میں کوئی کھڑکی سلامت نہیں تھی۔ لوگ انہیں نکال کرلے گئے تھے۔ وہ بلڈنگ ایسی طرز پر تعمیر کی گئی تھی کہ باہر سے اندر آنے والی روشنی اور ہوا کے علاوہ ان کو کوئی بھی دیکھ نہیں پاتا۔ پتہ نہیں شبانہ کے من میں کیا آئی کہ وہ سہیل کے ساتھ اس ویران عمارت میں آگئی تھی، جہاں پہنچ کر اسے اپنے دل میں ویرانی

بالکل محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر میں موجود ویرانی باہر نکل کر عمارت کی ویرانی کے ساتھ لائبریری میں مل گئی تھی۔ جہاں چمگادڑوں نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا اور روشنی بھی بہت کم تھی۔

ڈانس ہال میں بیٹھی شبانہ اچانک سہیل کے برابر سے اٹھ کر گانا گانے اور ڈانس کرنے لگی۔ سہیل نے اس کے جسم کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر ہلکے سے کاٹا۔ اس دن شبانہ سہیل کا امتحاں لے رہی تھی۔ دونوں ایک گھنٹے تک ساتھ بیٹھے رہے۔ وہاں سے نکلتے وقت شبانہ نے سنجیدگی سے اسے کہا، "ٹھیک ہے سہیل، میں تم سے شادی کروں گی۔" سہیل کے چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھنے لگی، "لیکن تمہارے ماں باپ مان جائیں گے؟"

سہیل نے نفی میں سر ہلایا، شبانہ کے سامنے اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ، "میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا، "لیکن وہ ہمیں شادی کرنے بھی نہیں دیں گے۔ میرا مطلب ہے وہ راضی نہیں ہوں گے۔"

شبانہ عمارت سے باہر نکل آئی۔ میدان میں سو سال پرانے پیپل کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر چھتیس ہزار پانچ سو دنوں کی لمبی سانس لی۔ اسے کسی وضاحت یا مزید سوال جواب کرنے کی ضرورت نہ تھی، وہ سمجھ گئی کہ سہیل کو یہ یقین کیوں ہے کہ اس کے ماں باپ راضی نہیں ہونگے۔ سہیل اسے یقین دلاتا رہا کہ شادی کے بعد وہ مان جائینگے، اس نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر وہ راضی نہ ہوئے تو وہ گھر چھوڑ کر اس کے ساتھ رہے گا۔ شبانہ نے بھی ہاں کر دی۔ اس دن انہوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ لوکوشیڈ سے کہیں باہر جا کر شادی کریں گے۔ سہیل نے اسے بتایا کہ روہڑی شہر میں اس کے دوست ہیں وہ ان کی مدد کریں گے۔

سہیل نے یہ بھی کہا کہ وہ سکھر سے اس کے لئے شادی کا جوڑا بھی لے آئے گا۔ شادی کے جوڑے والی بات پر پتا نہیں کیوں شبانہ کو کوئی خوشی محسوس نہ ہوئی۔

دو دن گھر میں رہی تو اسے یہ احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے یا وہ دلہن بننے والی ہے۔ شبانہ خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر شادی کے لئے کوئی حیا تھی۔

اسے یاد آیا جب پندرہ برس کی عمر میں وہ بچی سے لڑکی دکھنے لگی تھی تو اس کی ماں ذکیہ نے اس کی شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ اس کی زندگی میں پہلا دن تھا جب اس کے مسکراتے گلابی ہونٹوں اور گندمی رنگت والے چہرے پر حیا کا رنگ بکھر گیا تھا۔ اس کی ماں وہ رنگ دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر خوف کا رنگ بھی چھا گیا تھا۔ وہ اپنے سامنے جوانی کی فصل تیار ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چوری سے وہ فصل کٹ نہ جائے۔ ماں کی آنکھ نے آنے والے وقت کا رنگ بھی دیکھ لیا تھا اور پریشان بھی ہوئی تھی۔

اس کی ماں کے مرنے کے بعد جب اس کے باپ رحیم داد نے اس کی شادی گلزار کے ساتھ کرنے کے لئے شادی کا جوڑا لا کر دیا تھا تو اس نے صندوق کے کونے میں پھینک دیا تھا۔ اس کے بعد اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس کے گھر میں اس کی شادی کا جوڑا رکھا ہوا ہے۔ اس نے اس دن کے بعد شادی کا وہ جوڑا دوبارہ دیکھا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

اس کا دل اسے روک رہا تھا، اس کے ذہن کا خوف الارم کی طرح بجنے لگا تھا، لیکن وہ کیا تھا جو اسے روہڑی کی ایک تنگ گلی سے اس گھر کی پہلی منزل پر لے گیا، جہاں اپنی زندگی کو ایسے راستے پر لگا آئی جسے وہ عمر بھر سمجھ نہ پائی۔

وہ حیران تھی کہ سہیل موٹر سائیکل بھی چلانا جانتا ہے۔ شام کو مقررہ وقت پر جب اس

کا باپ گمن کے ہاں اپنے موالی دوستوں کے ساتھ چرس کا دور چلا رہا تھا، سہیل اسے لے گیا۔ زندگی میں پہلی بار شبانہ موٹر سائیکل پر بیٹھی تھی۔ وہ گھر سے پیدل نکل کر ایسی جگہ آئی تھی جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھنے کے بعد اس نے خود کو ہوا میں تیرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے بانہیں کھول کر ہواؤں کو گلے لگانا چاہا، لیکن گرنے کے ڈر سے سہیل کو پکڑ کر بیٹھی رہی۔ بہت ہی مختصر وقت کے لئے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ سہیل کو پکڑ کر بیٹھنے سے حفاظت کی بجائے اسے خوف کا احساس ہوا تھا، لیکن ہوائیں اس کے ان احساسات کو دھول کی طرح پیچھے اڑاتی گئیں۔

روہڑی کی ایک تنگ گلی میں موٹر سائیکل رکی۔ شبانہ نے دوپٹہ ٹھیک کیا۔ سہیل کے پیچھے دوسرے نمبر گھر کے ساتھ والی ایک تنگ سیڑھی چڑھنے لگی۔ سیڑھی اینٹوں سے بنی تھی اور وہ گھر بٹوارے سے پہلے کسی ہندو کا تھا۔ ایسے تنگ سیڑھیوں والے گھر روہڑی کی تنگ گلیوں میں کافی تعداد میں تھے۔ سہیل نے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھلا تو دونوں اندر داخل ہوگئے۔ شبانہ سہمے ہوئے انداز سے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے میں صوفہ سیٹ رکھا تھا، جس کی برابر میں شاید کھڑکی تھی وہاں ایک پرانا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ درمیاں میں ٹیبل رکھا تھا، جس کے نیچے کچھ اخبار اور رسالے پڑے تھے۔ ٹیبل پر ایک جگ اور چار گلاس رکھے تھے، کمرے میں ایک اور دروازہ بھی تھا جو دوسرے کمرے میں کھلتا تھا وہاں بھی پردہ لگا ہوا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھولنے والا پینتیس سالہ آدمی تھا، جس کی لمبی داڑھی تھی، اس کے گلے میں مفلر تھا، شبانہ کو لگا کہ وہ شخص مولوی ہے، اسے غیر واضح انداز میں یہ بھی لگا کہ داڑھی شوق سے بھی بڑھائی جا سکتی ہے۔ کچھ ہی لمحوں میں اندر والے کمرے کا پردہ ہٹا تو لمبے قد، ہلکی مونچھیں اور گہری بھنوؤں والا ایک نوجوان باہر آیا۔ پردہ ہٹنے کے وقت اس نے دیکھا کہ اندر والے کمرے میں کوئی فرنیچر نہیں ہے، بستر، قالین پر لگے ہوئے ہیں۔

داڑھی والے شخص نے اسے صوفہ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شبانہ بیٹھی تو سہیل بھی ساتھ بیٹھ گیا، ساتھ والے صوفوں پر پہلے سے موجود دونوں اشخاص بیٹھ گئے۔ مردوں کے ساتھ بیٹھی عورت کا جسم اس کی آنکھ بن جاتا ہے اور وہ سمجھ جاتی ہے کہ اس پر پڑنے والی نظریں کیانیت رکھتی ہیں۔

ان دونوں کی نظروں کو اس نے اپنے جسم پر محسوس کر لیا۔ اس نے اچانک سہیل سے سوال کیا، "کوئی عورت نہیں ہے کیا؟"

"تو تم کیا ہو؟" سہیل نے ان دو آدمیوں کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ شبانہ کے تاثرات سے سمجھ گیا کہ اسے شک ہو رہا ہے۔ ایکدم سے کہا، "تھوڑا صبر کرو آجائیں گی۔ تب تک تھوڑا آرام کر لیتے ہیں۔ غفار کی ماں اور بہن شادی کا جوڑا اور زیور لیکر آ رہی ہیں۔" اس نے ہلکی مونچھوں والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شبانہ نے غفار کی طرف دیکھا۔ اسے لگا کہ اس نے پہلے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس کی سوچ ابھی شناخت کی منزل تک نہیں پہنچی تھی کہ سہیل نے وہاں بیٹھے ہوئے دونوں دوستوں کا تعارف کروایا، "یہ غفار ہے اور یہ زبیر ہے۔"

شبانہ نے ایک دفعہ پھر غفار کی طرف سوچ میں ڈوبی ہوئی نگاہ ڈالی۔ غفار سمجھ گیا کہ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔

"میں دودھ والے کا بیٹا ہوں۔ گل محمد دودھ والا۔" اس نے اس کی پریشانی ختم کی، "ہمارا گھر بھی لوکوشیڈ میں ہے۔"

خبر ہی نہ ہوئی کہ دس سال کے اندر لوکوشیڈ میں ریلوے ملازمین کے کوارٹروں اور گارڈز کے مشترکہ کمروں کے علاوہ باہر سے آبادی بھی آکر بسی تھی۔ باہر والوں اور ریلوے ملازمین کی طرف سے ریلوے کے خالی پلاٹوں اور دیگر سرکاری اور لاوارث زمینوں پر قبضہ کر کے گھر اور

دکان بنا دیئے گئے تھے اور کچھ بھینسوں کے باڑے بھی کھل گئے تھے۔ پارکوں اور گھومنے پھرنے کے لئے خالی رکھے گئے مقامات پر عمارتیں اتنی تیزی سے بن گئیں، جیسے ساون کی بارش کے بعد کھنبیاں اگ آئی ہوں، مکانات میں کوئی ترتیب نہیں تھی، جس کا جتنا بس تھا، وہ قبضہ کر کے تعمیرات بھی کر رہا تھا۔ ہر کسی کے پاس ایک ہی جواز ہوتا تھا اور زبان زد عام تھا: "سندھ سمیت پورے ملک میں قبضے ہو رہے ہیں، ہم نے کیا تو کون سا گناہ کیا۔" ریلوے عملداروں کو قبضوں کے عوض رقوم بھی ملیں۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی ہوئی اور تینوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر، جب شبانہ پر نظر ڈالی تو اسے لگا کہ وہ بھی جیسے لوکوشیڈ کے کسی لاوارث پلاٹ کی طرح قبضے میں آگئی ہے۔ سہیل اٹھا اور اندر کمرے میں گیا۔ باہر آیا تو ڈش میں رکھی چار بوتلیں ٹیبل پر رکھیں۔ اس نے گہرے بھورے رنگ والی ایک بوتل اٹھائی، پیار بھری نگاہ اور مسکراہٹ سے شبانہ کو دیتے ہوئے کہا، "ایک بات کہوں، بالکل اداکارہ شبنم جیسی ہو، شاید اس سے بھی زیادہ خوبصورت۔"

پرلی طرف بیٹھے ہوئے زبیر نے جملہ کسا، "چل بے، ہماری بھابھی کے سامنے شبنم کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے غفار کی طرف دیکھا، "کیسا؟"

غفار صرف مسکرادیا۔ شبانہ نے بوتل سے پہلا گھونٹ بھرتے ہی محسوس کیا کہ اس کے ذہن سے جسم تک بجلی کے معمولی شاک کی طرح کوئی چیز دوڑ رہی ہے، اس نے کچھ دیر ٹھہر کر دوسرا گھونٹ لیا۔ اس کے لئے بوتل کا یہ ذائقہ کچھ مختلف تھا۔

شبانہ نے سہیل کی جانب دیکھا، "اصلی بوتل ہے،" سہیل نے شبانہ کی نگاہ میں چھپا سوال بھانپتے ہوئے کہا، "اس لئے اس کا ذائقہ مختلف ہے۔ شہر میں نقلی چیزیں نہیں بکتیں۔ ہمارے ہاں لوکوشیڈ میں زیادہ تر نقلی بوتلیں ملتی ہیں۔" سہیل نے بات سمجھانے کے لیئے وضاحت والے انداز سے کہا اور غفار کی طرف دیکھ کر یقین دلایا، "کیسے غفار؟"

"ہاں سہیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" غفار نے گردن ہلا کر کہا۔

جیسے جیسے بوتل خالی ہوتی گئی، وہ بوتل میں اترتی گئی۔ اس کے ذہن میں پیدا ہونے والا خدشہ بھی بوتل سے گھونٹ بھرنے سے پہلے والی جھاگ کی طرح ختم بھی ہوتا رہا اور بنتا بھی رہا۔

ہوش اور مدہوشی کے تار پر چلتے، اسے جو آخری جملہ سنائی دیا اور یاد رہا وہ سہیل کا تھا،

"پہلا حق میرا ہے۔"

ہوش میں آنے کے بعد اسے اس دن یہ بھی پتہ چل گیا کہ ایسے صرف حادثے اور فوتگیاں نہیں ہوتیں، صرف بھوک اور غربت ہی زمانے کے درد نہیں لیکن دھوکہ بھی خطرناک درد ہے۔ وہ کبھی ماں سے تو کبھی پڑوس کی بڑی بوڑھیوں سے جسمانی درد کے قصے سنتی تھی۔ کسی کو آنکھ میں درد ہو تو سنتی تھی: "آنکھ کے درد سے بڑی کوئی تکلیف ہی نہیں۔" درمیانی عمر کی کئی عورتوں کی داڑھ میں درد کی وجہ سے چیخیں سنی تھیں۔ ان دردوں کو دوائیوں سے یا دعاؤں سے ختم ہوتے ہوئے سنا تھا، لیکن اس کے ساتھ جو دھوکہ ہوا تھا، وہ تو کینسر اور ناسور کے مرض کی طرح اس کی زندگی کو لگ گیا تھا۔

☆☆☆

وہ دو راتوں کے بعد گھر پہنچی۔ یہ اتفاق تھا یا رحیم داد کی پریشانی، جب وہ گھر آئی تو وہ گھر میں موجود تھا۔ آتے ہی اس نے غصے سے پوچھا، "شبانہ تم رات کہاں تھی، میں گھر آیا تو دروازہ کھلا تھا، کچھ تو خیال کرو۔"

اسے باپ کا یہ غصہ اچھا لگا۔ شبانہ سمجھ گئی کہ اس کے باپ کو اس کے گھر سے غیر حاضر رہنے کی بس اتنی خبر ہے کہ وہ گذشتہ شب ہی گھر نہیں تھی۔ کئی بار ایسا ہوا تھا جب نشے میں دھت

رحیم داد گھر آتا تھا تو آتے ہی سو جاتا تھا اور صبح کو سویا ہی ہوتا تھا تو شبانہ ناشتہ کر کے یا صرف چائے پی کر سنبل کے گھر جاتی تھی، یا پڑوس میں کسی نہ کسی کے گھر چلی جاتی تھی۔ رحیم داد نیند سے جاگتا تھا تو وہ بھی وہاں سے نکل جاتا تھا۔ کبھی سیدھا گلزار کے ہاں تو کبھی لوکوشیڈ ورکشاپ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس کی نوکری آدھی تنخواہ پر چل رہی تھی۔ وہ اکیلا ایسا ملازم نہیں تھا، جو اپنی متعلقہ آفس میں آدھی تنخواہ دے کر کام چلا رہا تھا۔ رحیم داد ایسا شخص بن گیا تھا جسے نشے کی عادت نے ذہنی اور جسمانی طور پر احساسات سے عاری کر دیا تھا۔ جمیل کا باپ کریم بخش غصے میں آکر کبھی کبھی رحیم داد کو راستے میں روک کر گالیاں دے کر کہتا تھا، "تم جیسے لوگوں کے آگے غیرت کوئی معنی نہیں رکھتی، نہ ہی بے غیرتی۔ تمہیں تو عزت کا پتا ہے اور نہ ہی بے عزتی کا۔"

ایک دوبار رحیم داد نے غصہ کرتے ہوتے کریم بخش کو جواب دینے کی کوشش کی تھی تو کریم بخش نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتا تھا، "ہاں ہاں ایسے ہی کچھ غیرت کرو!"

رحیم داد کا غصہ چند لمحوں کا مہمان ہوتا تھا۔ رحیم داد نے اس دن شبانہ کے آنے پر اس سے پوچھ گاچھ صرف اس لئے نہیں کی تھی کہ اسے اس کی رات میں غیر موجودگی اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی ناراضگی کا سبب اس کے مہمان کا گھر سے لوٹ جانا تھا، وہ مہمان اسی قسم کا تھا، جو کئی برس پہلے اس نے اپنی بیوی کی طرف بھیجا تھا۔

باتوں باتوں میں اس نے اگل دیا کہ جوے میں وہ سب کچھ ہار گیا تھا اور ادھار پر بھی جوا کھیلا تھا اور ادھار چکانے کے لئے جیتنے والے کو شبانہ کی طرف بھیجا تھا۔ شبانہ نے اپنی مٹھی کھولی، اس کی ہتھیلی پر تہہ شدہ دس دس روپے کے دس ہرے نوٹ تھے۔ اس نے ہاتھ باپ کی طرف بڑھایا، "یہ لو جاکر قرضہ اتارو۔ ایک ہی بات ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تم اتنے پیسے کہاں سے لائی؟" جھپٹ کر شبانہ کی ہتھیلی سے پیسے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جس طریقے سے تمہیں پیسے چاہیئے تھے اسی طریقے سے آئے ہیں۔ تمہارا کام پیسوں

سے ہے نا!"شبانہ نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

رحیم داد کمرے کی طرف جاتی ہوئے بیٹی کو دیکھنے کی بجائے جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔وہ بات سمجھ گیا تھا۔اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔شبانہ نے باہر جاتے ہوئے کمرے میں اس کی آواز سنی۔"یہی تو کہتا ہوں، کتنی سمجھدار ہے میری بیٹی۔"

شبانہ کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کرے۔۔کیا کہے؟اس کے ساتھ جو ہو چکا تھا،اسے کوئی خواب کہے یا وہم سمجھے یا پھر وقت کا ایسا گھوڑا سمجھے جس پر وہ سوار ہو کر بیٹھ جائے اور خاموش رہے جو اسے جس طرف بھی لے جائے۔اسے اتنا یقین ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی میں جو ہو چکا،وہ ایسی بات کی ابتدا تھی، جس کا کوئی اختتام نہیں تھا۔جو کچھ بھی ہو رہا تھا،اس نے اس سے حاصل کرنے کی سوچ چھوڑ دی۔کبھی کبھی اسے یہ پریشانی تنگ کرتی تھی کہ کیا حاصل؟کس لئے حاصل اور کہاں سے وہ حاصل آئے؟

اس دن باپ کے خوشی سے باہر جانے پر اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔اسے جمیل شدت سے یاد آیا۔اسے لگا کہ اس کا باپ پیسے لیتے وقت جس طرح خوش ہوا تھا،ویسے ہی جمیل بھی اس کے ساتھ گھر میں دوسری شام کی ملاقات کے دوران خوش تھا۔اسے باپ کی اس خوشی پر نفرت کا احساس ہوا اور جمیل کے لئے پیار کا احساس۔جس میں غصہ بھی بھرا ہوا تھا تو اپنا پن بھی۔دونوں کے لئے ایسے مختلف خیالات نے اس کا ذہن الجھایا ہوا تھا۔

رات کو نیند میں تڑپتی رہی تو اسے بے خوابی بھی ستاتی رہی۔شبانہ جاگ اور نیند کے جھگڑے میں اس دوراہے پر کھڑی رہی جس کا ایک راستہ جمیل کی طرف اور دوسرا اس کے باپ رحیم داد کی طرف جا رہا تھا۔جب رات تھک چکی اور اس پر ہوا کے ساتھ شفق کی روشنی چھانے لگی تو آخر کار شبانہ کو بے خوابی نے چھوڑ دیا اور وہ نیند کی کالی چادر میں گم ہو گئی۔

دوپہر کو جاگی تو اس کی چارپائی پر سنبل بیٹھی تھی۔وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔اس

دن شبانہ نے سنبل کو سب کچھ بتادیا۔ سنبل نے حیراں پریشاں ہونے کی بجائے اسے کہا،"پاگل! تم خود کو ایسے ضائع مت کرو۔"

شبانہ اس کی بات کو سمجھ نہ سکی۔ سنبل نے اس موضوع پر پھر کبھی تفصیل سے بات کرنے کا کہہ کر، اسے مزید حیران کر دینے والی بات کہی،"چاچا رحیم داد آیا تھا، اماں اور مجھے کہہ رہا تھا کہ تم جوان ہو گئی ہو، زمانہ خراب ہے، اس لئے تمہاری شادی کے لئے ہاتھ بتائیں۔"

شبانہ کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہ تھا۔ دونوں نے شادی کے حوالے سے بہت سی باتیں کیں۔ شبانہ دلہن بننے کے لئے تیار ہو گئی۔ سنبل نے گلزار کے ساتھ شادی پر کچھ اعتراض کیا تو شبانہ نے اسے کہا،"میں اب ایسے ہی شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

"شبانہ کی شادی!"

"شبانہ کی شادی!"

"شبانہ کی شادی!"

سارے محلے میں شور مچا تھا، لیکن اس کے حسن پر حیران کچھ نوجوانوں کے دلوں پر سوگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان جیسوں کے لئے تو وہ شبنم کے طور پر مشہور ہو چکی تھی۔ سہیل ہو یا غفار یا پھر وہ جو اس کے لئے امید کے درخت اگا چکے تھے، ان سب کے ہاں اس کی شادی والے دن یہی سرگوشیاں تھی:

"شبنم کی شادی ہو رہی ہے!"

"شبنم کی شادی ہو رہی ہے!"

یہ کہنے والے صرف نوجوان ہی نہیں، روہڑی اسٹیشن اور لوکو ورکشاپ میں کام کرنے والے کلاس فور کے کئی ملازمین بھی تھے تو بوڑھے اور رٹائرڈ ملازمین کی اولاد یا رشتے دار بھی تھے، جتنا شور باہر تھا اس سے زیادہ خاموشی نے شبانہ کو گھیرا ہوا تھا۔

اس کی شادی والی شام پڑوس کی عورتوں نے اسے سنگھار کرایا۔ پڑوس کی لڑکیوں کو وہ اچھی لگ رہی تھی۔ مسکراتی ہوئی سہیلیوں کے بیچ اس کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ تھی۔ سنبل نے ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا کر انہیں گلاب کی پنکھڑیاں بنا دیا تھا۔ شبانہ کی شادی میں باہر نوجوانوں نے رقص کیا۔ نکاح سمیت ساری رسمیں ہو گئیں۔

جب سب لوگ چلے گئے، شبانہ کو لگا کہ جیسے کچھ دیر پہلے اس ویران جگہ پر کوئی حادثہ ہوا ہے۔ لوگ اکٹھے ہوئے اور پھر سب چلے گئے۔ اس کی عمر کا یہ اکیسواں برس تھا، وہ ایسے شوہر کی بیوی بنی جو اس کے پاس پہنچا تو اسے لگا کوئی حادثے کا زخمی اس کے پاس پہنچایا گیا ہو۔ ایسا زخمی جس کے جسم پر کوئی چوٹ تو نہیں تھی لیکن وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ گلن نے شادی والی رات بھی نکاح کے بعد اتنا نشہ کیا تھا کہ وہ جب چار گھنٹے کے بعد گھر آیا تو اسے ہوش ہی نہیں تھا اور جو کچھ بھی وہ بول رہا تھا شبانہ بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بستر پر آکر گرا ایک ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے اسے نیند آگئی۔ یہ تھی شبانہ کی بارات اور اور اس کی سہاگ رات۔

اس سے کہیں زیادہ مزا تو اسے بچپن میں گڈنے اور گڑیا کی شادی کرانے میں آیا تھا اور اس نے خوشی منائی تھی۔ شبانہ نے دو رلیاں زمین پر بچھائیں اور اپنے بازو کو تکیہ بنا کر سو گئی۔

شادی کی صبح نئے انکشافات سے بھرپور تھی۔ گلن اپنا کوارٹر بیچ چکا تھا۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ رحیم داد نے جوا اور نشے میں گلن کا سب کچھ بکوا دیا تھا اور طے ہوا تھا کہ اب گلن اس کے گھر میں رہے گا۔ ویسے تو شادی جون میں طے تھی لیکن گلن نے جن سے کوارٹر کی پگڑی کے پیسے لیے تھے انہوں نے بمشکل ایک ہفتے کی مہلت دی تھی۔ اس لئے رحیم داد نے سنبل اور اس کی

ماں کو درمیان میں لا کر شادی جلدی کروادی۔ شبانہ کے لئے زندگی نے ایک اور کروٹ لی تھی۔ اس موڑ پر آکر اس نے راستے گننا چھوڑ دیا۔

گلزار اس کا شوہر بن چکا تھا لیکن اس نے کبھی بھی محسوس نہیں کیا کہ اب وہ شادی شدہ زندگی گذار رہی ہے۔ وہ اپنے باپ سے بھی لاتعلق ہوگئی تھی اور اس کے پاس باپ کے لئے نفرت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس سے دور ہونا بھی اس کے بس میں نہ تھا۔ اس دن اسے صرف ایک لمحے کی ہی حیرانی ہوئی تھی جس دن اس کے شوہر نے اس کے پاس ایک آدمی بھیجا تھا۔ اسی دن ہی وہ اپنے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ واپس لے آئی جو دیکھ کر اس کی ماں خوش ہوا کرتی تھی۔ یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ ایک دو بار سوچنے کے بعد اس نے اس پر بھی سوچنا چھوڑ دیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر باہر نکلنا شروع کیا تو سارے راستے پر پھول جھڑنا شروع ہوگئے۔

☆☆☆

شادی کے بعد لوگ شبانہ کا نام ہی بھول گئے۔ دو سال کے اندر ہر کسی کی زبان پر اس کا نام شبنم تھا۔ اسے اسی نام کے ڈائیلاگ بھی سننے پڑتے تھے، کوئی اس کا اوس والی شبنم سے موازنہ کر کے کہتا تھا "سوکھے پھول پر گرے تو وہ بھی تازہ ہو جائے، اگر سوکھے پتے پر تو وہ بھی ہرا ہو جائے۔"

اسے یہ پتہ چل چکا تھا کہ رات کے اندھیرے میں اس کے پاس آنے والوں کو کبھی رحیم داد تو کبھی گلزار بھیجتا تھا۔ ایک دن وہ حیران رہ گئی جب اس کے پاس سنبل کا دوست عرفان پہنچا۔

"مجھے آنٹی رفعت نے بھیجا ہے۔"

اس نے شبانہ کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا، "وہی تازہ چہرہ جو اسٹیشن پر دیکھا تھا۔"
شبانہ پریشان ہو گئی، "آنٹی۔۔ لیکن کیوں؟" اس نے سوچا شاید کسی کام سے بھیجا ہے۔
عرفان نے سرگوشی کرتے ہوئی کہا، "کیوں کہ میں سنبل سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور وہ خواہ مخواہ مجھ میں سیریس ہے۔ سو آنٹی کا خیال ہے کہ میں تم سے ملوں گا تو وہ غصے میں۔۔۔۔"

شبانہ بات سمجھ گئی اور غصے سے آگ بگولہ ہو گئی، "اٹھو یہاں سے، جوتے نہ لگاؤں!" شبانہ کا یہ نیا لہجہ تھا، "تم کیا سمجھتے ہو، جس کا جی کرے گا میں اس کے لئے استعمال ہوں گی۔ سنبل میری دوست ہے۔ دوبارہ تم نے سوچا بھی ناتو۔۔۔"

عرفان نے ایکدم باہر نکلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ شبانہ حیرانی کے ساتھ برآمدے سے اٹھ کر صحن میں آئی۔ اس کے دماغ میں غصے سے ڈھول بج رہے تھے۔

شبانہ کے ہاں لوگ ایسے احتیاط سے آتے تھے کہ کوئی انہیں دیکھ نہ لے۔ لیکن تاڑنے والوں کو اندازہ ہو جاتا تھا، کیوں کہ عام طور پر شبانہ کے گھر کے باہر والے دروازے کا ایک کواڑ کھلا رہتا تھا۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ وہ باپ کے بے وقت گھر آنے کے لئے دروازہ کھلا رکھتی تھی۔ اگر کوئی اندر آتا تھا تو دروازہ بند کر کے آتا تھا۔ عرفان تو بڑی دیدہ دلیری سے آیا تھا، جیسے اسے سرکاری طور پر اجازت ملی تھی لیکن واپسی پر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

باہر شور سا مچ گیا۔ گالیوں اور 'چھوڑ دو چھوڑ دو' کی آوازیں تیز ہوتی گئیں۔ شبانہ دروازے کے پاس آئی باہر دیکھا تو سہیل، اس کے دوست اور کچھ پڑوسی عرفان کی پٹائی کر رہے تھے اور کچھ لوگ ان کو چھڑانے کی کوشش میں تھے۔ عرفان کو موقع ملا تو اس نے بھاگ کر جان چھڑائی۔ دروازے پر کھڑی شبانہ نے سہیل کا جملہ سنا، "کتے کا بچہ ہمیں بھڑوا سمجھ رکھا ہے۔" کپڑے جھاڑتے ہوئے شبانہ کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھ کر کہا، "یہاں آکر بدمعاشی کرے گا، ہم مر گئے ہیں کیا۔"

یہ اس طرح کا پہلا واقعہ نہ تھا، اس سے پہلے بھی سہیل اور اس کے دوستوں نے دو مرتبہ لوگوں کی پٹائی کی تھی۔ شبانہ کو سہیل ایک نظر نہیں بھاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس دن شبانہ کے دماغ کو پتا نہیں کیا سوجھی، جو اس نے گھر میں رکھا ہوا پائپ کا ٹکڑا اٹھایا اور گرجتی ہوئی سہیل پر آکر برس پڑی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ سہیل کے ساتھ ، عرفان کو بھی کوٹ رہی ہے۔

شبانہ کا یہ رنگ اور ڈھنگ سب کے لئے بالکل نیا تھا۔ کئی اس کا غصہ دیکھ کر بھاگ گئے۔ جب اس نے سہیل کو پائپ سے پیٹنا شروع کیا اور سہیل بھی شبانہ کے ساتھ لڑنے لگا تو اس وقت جمیل کا باپ کریم بخش بھی وہاں پہنچا۔ جسے دیکھ کر سہیل نے بھاگنے میں عافیت جانی۔ وہ جاتے جاتے اسے دھمکا کر گیا، " میں تمہیں دیکھ لوں گا!"

کریم بخش، شبانہ کے قریب آیا وہ بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ اس نے اس پر غصہ ہونے کے بجائے شفقت بھرے انداز سے سمجھاتے ہوئے کہا، "میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کرتا رہتا ہوں، مجھے پتا ہے تم کتنی مجبور ہو۔"

شبانہ کے لئے کریم بخش کا یہ لہجہ گرمیوں میں برف باری کی طرح تھا، "لیکن بچی، اگر تم چاہو تو اپنی ماں کی طرح نیک نام ہو سکتی ہو۔ جس کی نیک نامی، تمہارے گھر کے چھوٹے سے کمرے سے ہی ہر جگہ پہنچی ہوئی تھی۔" اس کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "سب اس کی مثالیں دیتے تھے اور صرف اس کی باتیں بھی پہنچتی تھیں تو ان کے لئے گھروں کے دروازے کھل جاتے تھے۔ لیکن تم نے جو راستہ چنا ہے، لوگ تو کانوں میں بھی روئی بھرنا چاہتے ہیں کہ تمہاری یہ باتیں ان کے گھروں تک تو کیا کانوں تک بھی نہ پہنچیں۔" کریم بخش نے آگے جاتے ہوئے کہا۔ "خود کو سنبھالو بیٹی!"

شبانہ اروڑ کے پہاڑوں میں پڑے پتھروں کی طرح کچھ لمحے وہاں منجمد ہو کر کھڑی

رہی۔ واپس مڑی تو اسے لگا کہ اس نے لوہے کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور چلنے سے قاصر ہے۔ کمرے میں آکر اسے جمیل کی یاد آئی۔ اسے خیال آیا کہ وہ سیدھا کریم بخش کے گھر جائے اور اسے بتائے کہ اسے شبانہ کی بدنامی تو خراب لگتی ہے لیکن جمیل کا کام آخر فخریہ کیوں ہے!؟ لیکن دوسرے لمحے نے اسے روک دیا۔

اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا تو وہ سنبل کے پاس چلی گئی۔ رفعت نے شبانہ کو دیکھا تو اسے یہ خوف ہونے لگا کہ کہیں وہ سنبل کو کچھ بتا نہ دے لیکن شبانہ کے چہرے پر اداسی تھی اور ہونٹوں سے چپکی وہی مسکراہٹ۔

وہ اس رات سنبل کے پاس رکی۔ سنبل اور شبانہ جب کمرے میں اکیلی تھیں تو سنبل اسے پریشاں لگی۔ شبانہ کے زور بھرنے پر اس نے اسے بتایا، " میری ماں مجھ پر شادی کے لئے دباؤ ڈال رہی ہے۔"

شبانہ نے اسے ہمت دلاتے ہوئے کہا، "اس میں برائی کیا ہے، اچھا ہے اپنے گھر کی ہو جاؤ گی۔"

سنبل نے چڑچڑاہٹ سے کہا، "پوری بات تو سنو، اماں میری شادی اپنے چچازاد کے بیٹے کے ساتھ کروانا چاہتی ہے۔"

شبانہ نے چہرے پر خفگی جیسے تاثرات لاتے ہوئے کہا، " تمارے والے عرفان سے تو اچھا ہو گا۔"

سنبل کی آواز غمزدہ ہو گئی، "یار، اماں جس کے ساتھ مجھے شادی کرنے کا کہہ رہی ہے اسے ایسی بیماری ہے کہ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ اس کے پاس دو تین سال ہیں۔ اس کے بعد وہ مر جائے گا۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔" سنبل اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں دے کر سسکتے ہوئے بولی، "ان کو شادی کی جلدی اس لئے ہے کہ اسے اولاد ہو جائے۔" سنبل کی سسکیاں بڑھ گئیں۔

شبانہ نے اسے گلے لگایا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے لگی۔ سنبل کی سسکیاں اور آنسوں بند ہوئے۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ "اچھا ہے اس سے شادی کرلو۔ "شبانہ نے خاموشی توڑتے ہوئے اسے سمجھایا، "عرفان بڑا حرامی ہے وہ تم سے کبھی بھی شادی نہیں کرے گا۔ "شبانہ نے سنبل کی طرف دیکھے بنا کہہ دیا۔

سنبل کے لئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں تھی، "ہاں مجھے بھی اندازہ ہے، اسے کرنی ہوتی تو کرلیتا۔ وہ اپنا مقصد پا تا رہا ہے۔ دوسری بات کہ اب تو ممکن ہی نہیں اس نے مجھے فرحان سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔"

"اسی لئے کہہ رہی ہوں اس سے شادی کرلو، تمہاری ماں بھی خوش ہو جائے گی۔ تم بتاؤ تم ایسی ہو کہ ساری زندگی ایک ہی مرد کے سائے سے چپکی رہو؟"

اس کے بعد دونوں کے درمیان اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔

شبانہ کو کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ کروٹیں بدلنے پر سنبل نے بھی اس سے پوچھا، "تمہیں نیند کیوں نہیں آ رہی؟"

"پتا نہیں، لیکن تم بھی تو جاگ رہی ہو" شبانہ نے جواب دیا۔

"ہاں شاید تمہاری طرح مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔ شاید ایک جیسا فراق ہے۔" سنبل نے بے سبب جملہ کہا اور شبانہ کی طرح چھت کو گھورنے لگی۔

☆☆☆

"گلزار مر گیا!"

"گلزار کو بیوی نے مار ڈالا!"

"گلزار نشے سے مر گیا۔!!"

"گلزار کو سسر نے مار ڈالا۔!!"

جتنے منہ اتنی باتیں۔ شبانہ سگنل کے پاس ہی تھی کہ اسے خبر ملی اور وہ دوڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ کوئی اچھا لگے یا نہ لگے رشتے کی خوشبو کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ لاش صحن میں پڑی تھی، اس کا باپ اور کچھ پڑوسی موجود تھے۔ گلزار کو سر میں چوٹ لگی تھی۔ وہ موقع پر ہی فوت ہو گیا تھا۔

شبانہ کی خوش نصیبی تھی یا اس کے باپ کی بد نصیبی۔ سہیل غصے میں آکر شبانہ سے شام والے واقعے کا بدلہ لینے کے لئے غفار کے ساتھ مل کر رات کے آخری پہر اس کے گھر میں داخل ہو گیا تھا۔ شبانہ سنبل کی طرف تھی، جس وقت سہیل اور غفار گھر میں داخل ہوئے تو گلزار بھی نشے کی حالت میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ دونوں نے ڈر سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو گلزار ان کے سامنے آگیا، جسے دھکا دے کر دونوں باہر چلے گئے۔ وہ دھکا اتنی زور سے لگا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ وہ پہلے ہی پتلی لکڑیوں کی ہلکی گٹھڑی جیسا تھا۔ چوٹ لگتے ہی اس کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔

سہیل اور غفار ایسے گولی ہو گئے جیسے وہ آئے ہی نہیں تھے۔ دو تین ٹرینیں سیٹیاں بجاتی گذر گئیں۔ صبح ہوئی تو رحیم داد بھی گھر پہنچا، اس نے گلن کو ایسی حالت میں دیکھا۔ پہلے تو ڈر گیا، شبانہ کو پکارا، چیخا۔ شبانہ تھی ہی نہیں جو آتی۔ پڑوس والے آگئے، گلن کی نبض دیکھی، دل پر کان رکھے لیکن دل دیوار کی طرح خاموش تھا اور صرف زندوں کو معلوم تھا کہ اب گلن اس جہاں میں نہیں رہا۔

شبانہ یہ سنتی آئی تھی کہ مصیبتیں، مصیبتوں کو بلاوا دیتی ہیں۔ مرنے سے پہلے اس کی ماں بھی اسے کہہ گئی تھی کہ اس کی زندگی میں اب دکھ ہی دکھ ہونگے۔ اس نے دکھوں اور بد نصیبی والے جانور کی شکل تو نہیں دیکھی تھی لیکن وہ ان دیکھا جانور اس کی ماں کو کھا گیا تھا اور اس کے بعد

اس کی زندگی ایسے چلنے لگی جیسے کوئی ریل بغیر ڈرائیور کے پٹریوں پر چل رہی ہو۔

جس طرح اوکوشیڈ میں آبادی بڑھتی گئی ویسے اس کی زندگی بھی ایسے حالات کے ہتھے چڑھتی گئی، جو اس کے بدن کو کھروچتے رہے۔ اس کی روح صحرا کی چیخ بنتی گئی۔ اس کے شوہر کے مرنے والے واقعے نے اسے مزید تنہا کر دیا تھا۔ پولیس نے اس کے باپ کو گرفتار کر لیا۔ خیال یہ ظاہر کیا گیا کہ اس نے گلزار کے پیسے ہڑپ کر لیے تھے جس پر جھگڑا ہوا اور وہ چوٹ لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ شبانہ کو شوہر کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ رحیم داد اور گلن کے مابین پیسوں کی لین دین پر جھگڑا بھی ہوا تھا۔ گلزار نے تھانے جا کر اپنے سسر رحیم داد کے خلاف رپورٹ بھی داخل کروائی تھی اور اگلے دن گلزار کی ہلاکت کا واقعہ پیش آ گیا تھا۔ پولیس نے اس ہی بنیاد پر اسے گرفتار کیا تھا۔

رحیم داد کے لاک اپ میں ہونے کے بعد شبانہ ہفتہ بھر صدمے سے دوچار رہی۔ سنبل اس کا سہارا بنی ہوئی تھی، وہ دو راتیں اس کے پاس اس کے گھر میں رہی۔ دو دن دو راتیں اس نے بھوک کی حالت مین گذاریں۔ صدمہ کیا ہوتا ہے؟ یہ شبانہ محسوس کر رہی تھی۔ ضبط کی معنی بھی اس نے سیکھ لیے تھے۔ اس کے لئے دو ہی راستے تھے۔ اس صدمے سے مر جائے یا پھر ضبط اور صبر کی اس انتہا تک جائے جسے زمانے میں ڈنگر بھی کہتے ہیں اور ڈھیٹ بھی۔ اگر وہ کسی کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتی تو اسے عقلمندی کا نام دیا جاتا اور اسے صابرین جیسے القابات سے نوازا جاتا۔ لیکن وہ جہاں تھی، اس ماحول میں ایسے صبر کو ڈھٹائی کہا جاتا تھا۔ اسے تہمتوں کی اتنی فکر نہیں تھی جتنا وہ اس بات سے خفا تھی کہ اس کی زندگی سے دکھوں کا یہ سفر ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال آنے لگتا کہ کیا یہ دکھ بھی اس کی زندگی میں سانس کے جیسے ہیں اور اسی کے ساتھ ہی جائیں گے۔

شبانہ کے روح کی تبسم، اس کے لئے بڑی طاقت تھی۔ وہ دو دن کے بعد گھر آئی۔ اسے لگا کہ وہ تنہا ہے۔ گھر تنہا ہے، کمرہ تنہا ہے اور برآمدہ بھی تنہا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ دنیا

میں ہر کوئی تنہا ہے اور ہر ایک کو اپنی تنہائی کے ساتھ رہ کر اسے ہی اپنا ساتھی بنانا ہے۔ کمرے میں آکر اس نے گہری سانسیں لیں۔ اسے لگا کہ اس کی تنہائی اس سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ اب تنہا نہیں ہے۔ تنہائی کو خوف بنانے کے بجائے اس نے اسے اپنا دوست بنا لیا۔ اس احساس نے دو دن کے اندر اسے خوف سے آزاد کر دیا۔ وہ خوف اس کے ذہن سے اترنے لگا، جیسے سرد ہوائیں پتوں کو گرا کر درختوں کو ننگا کر دیتی ہیں۔

ہفتہ کی شام اس نے روہڑی تھانہ کے لاک اپ میں جا کر باپ سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات کروانے میں اسٹیشن کے بکس پورٹر مجید نے اس کی مدد کی، جو ریلوے میں کلاس فور کے ملازمین کی یونین کا عہدیدار بھی تھا۔ یونین کے سارے عہدیداروں نے رحیم داد سے لاک اپ میں جا کر ملاقات کی تھی۔ جہاں رحیم داد نے پاک کتاب کی قسمیں کھائیں۔ اس نے یونین والوں کو بتایا کہ وہ اس رات لوکوشیڈ ورکشاپ کے پیچھے کیبن میں قدرت اللہ کے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ کھا پی کر صبح کو ساتھ آیا تھا اور اسی نے اسے گھر کے دروازے تک چھوڑا تھا۔ رحیم داد نے آنے کا جو وقت بتایا تھا، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق گلزار اس وقت سے چار گھنٹے پہلے فوت ہوا تھا۔ قدرت اللہ بھی اس کے حق میں بولا تھا۔ جس کی وجہ سے یونین کی طرف سے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

رحیم داد لاک اپ میں کھڑا تھا، اس کی حالت خراب تھی، بڑھی ہوئی داڑھی، میلے کپڑے، بکھرے ہوئے بال اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شبانہ کو پہلی بار باپ پر ترس آیا تھا، جو اس نے دل اور روح میں محسوس کیا۔ اس نے رحیم داد کے گالوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے نکلے جیسے کسی مزار سے کبوتر نکل پڑے ہوں۔ شبانہ اور رحیم داد کے گالوں پر آئے ہوئے آنسوؤں کے بعد پیدا ہوئے احساسات آسمان سے بہنے والی دودھ کی ندی جیسے تھے۔ کچھ لمحوں کے لئے ہی سہی لیکن اس سکون نے شبانہ کے روح کی تھکاوٹ دور کر دی۔ اس کا دماغ سیاہ

بادلوں کے بعد نیلے رنگ کے آسماں کی طرح چمکدار تھا۔

رات کو جب شبانہ اپنے کوارٹر کی طرف آ رہی تھی اور وہ اپنے گھر سے دو گھر پیچھے تھی کہ اچانک مجید کے گھر کا دروازہ کھلا، اس کا بازو باہر آیا اور اگلے لمحے شبانہ کوارٹر کے صحن میں تھی۔ وہ سمجھ گئی کے مجید اس سے مدد کا معاوضہ چاہتا ہے۔ شبانہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لیکن اس کے چہرے پر آئی پریشانی کو مجید نے بھانپ لیا۔ "گھر میں کوئی نہیں، ڈرو مت۔"

خاموشی سے لیٹی ہوئی شبانہ اس رات چھت کی اینٹیں گنتی رہی۔ جاتے وقت بے دھیانی میں مجید سے کہا، "یہ کمرہ ہمارے کمرے سے بڑا ہے، اس میں پانچ سو چھپن اینٹیں ہیں۔"

مجید اس کی بات سمجھ نہ پایا۔ وہ مجید کو سوچتا ہوا چھوڑ کر اپنے کوارٹر میں چلی آئی۔ گھر میں آئی تو اس کے ذہن پر باپ سے ملاقات والا سکون طاری تھا۔ اس نے جو وقت مجید کے پاس گذارا اسے یاد ہی نہیں تھا۔ ہلکے ہلکے سے دکھتے ہوئے درد کا قرار اسے کبوتروں کے پروں پر بٹھا کر روئی کی طرح بادلوں جیسی نیند کی طرف اڑا کر لے گیا۔ کئی دنوں کے بعد اسے گہری نیند آئی تھی۔ وہ خود کے ساتھ سوئی ہوئی تھی، نہ کوئی ڈر نہ کوئی خوف۔ نیند بھی ایسی، جس کے کسی بھی حصے میں کوئی خواب نہیں دیکھا۔

☆☆☆

جب خیالات صاف ستھرے ہوتے ہیں تو اچھا وقت بھی یاد آتا ہے۔ بھیانک خیالات خوفناک خوابوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ شبانہ صبح جیسے ہی نیند سے جاگی تو اسے پہلا خیال جمیل کا آیا، جس کے ساتھ گندے پانی کے تالاب میں کنول کے پھول دیکھتے ہوئے ملی تھی۔ اسے پھولوں کی طرح مہکتے اور بے پرواہ دن یاد آئے۔ جمیل کا خیال اس کے لئے اس وقت تک سفید کبوتروں کی

مانند تھا جب تک وہ اس کے کوارٹر میں نہیں آیا تھا۔ اس کی زندگی کے دوپٹے میں دو ہی تو گرہیں لگی تھیں جنہیں کھول کر ان میں بندھے ہوئے پیار کو نیچے گرانا اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ ایک ذکیہ کی شفقت اور دوسرا جمیل کا پہلا پیار۔

اس کے باپ کو شخصی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ گلن کی موت لوگوں کے لئے معمہ بنا ہوا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ قیاس آرائیاں اتنی زیادہ ہو گئیں تھیں جتنی لوکوشیڈ کی آبادی۔ ریلوے کی پرلی طرف علی واہن تک بے ترتیب گھر بن گئے تھے۔ جب اس کا باپ گھر آیا تو اس کے دوستوں کی بڑی تعداد ریلوے پٹری کی پرلی طرف سے آئی۔ گھر میں وہ ایک دن رحیم داد شبانہ کو اس مرد جیسا لگا جو واقعی گھر کا بڑا ہوتا ہے اور گھرداری میں سنجیدہ ہوتا ہے۔ شبانہ کو صبح سے شام تک روشنی کی ہر کرن اچھی لگی۔ شام میں لوگوں کی آمد کم ہوئی، کچھ نے اس کے ساتھ داماد کی وفات پر تعزیت بھی کی۔

شبانہ نے رحیم داد کو چائے بنا کر دی۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ اس کی بیٹی نہیں پر وہ ماں ہے، جو بچپن میں اسے ہدایات دیتی تھی، سمجھاتی تھی۔ اس کا لہجہ شفقت بھرا بھی ہوتا تھا تو تیکھا اور ترش بھی ہوتا تھا۔ باپ اور بیٹی رات کا کھانا اکٹھے کھا رہے تھے تو شبانہ نے اسے جوا اور نشہ سے دور رہنے کی التجا کی، رحیم داد نے صرف گردن ہلا کر ہاں کی۔

جوا اور نشہ بھی رحیم داد کے جسم کے اعضاء بن گئے تھے۔ اس لئے وہ بہت بے چینی کی نیند سویا۔ صبح سویرے اٹھ کر انہی یاروں کے پاس چلا گیا جہاں اسے کچی شراب یا ٹھرا ملتا تھا اور چرس بھی۔

شبانہ نے سمجھا کہ اس کا باپ دوپہر میں آئے گا اس لئے اس نے باپ کے لئے کھانا بھی پکایا لیکن کھانا بھی شبانہ کے انتظار کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ شبانہ گھر سے نکلی اور کسی طرف دیکھے بنا سنبل کے گھر کے پاس پہنچی۔ سنبل کا بھائی سلیمان اسے دروازے پر مل گیا جس نے اسے بتایا کہ

سنبل گھر میں نہیں ہے۔ رفعت نے اندر سے سن کر کہا، "آؤ آؤ شبانہ اس منحوس کی بات کو دفع کرو۔"

شبانہ نے سلیمان کے شرمندہ ہونے والے تاثرات دیکھے تو اس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور سلیمان وہاں سے چلا گیا۔ شبانہ اندر آئی تو رفعت نے اسے بتایا کہ سنبل آنے والی ہے۔ دونوں برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رفعت نے اس سے سارے واقعہ کے بارے میں گفتگو کی۔ شبانہ کے لئے یہ بات زیادہ دلچسپی کا باعث نہ رہی تھی۔ لیکن اس نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ اب کچھ خالی خالی سی ہوگئی ہے۔ رفعت نے اسے بتایا کہ سنبل کی شادی طے ہوگئی ہے۔ شبانہ کو اس بات کی نہ زیادہ خوشی ہوئی اور نہ ہی حیرانی۔ لیکن رفعت کی اس بات نے اسے حیران کر دیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ میرا دوست سلطان، جو مجھے زور بھی کرتا ہے، وہ سنبل سے ملے، اگر تم۔۔۔" اس نے شبانہ کے چہرے پر نگاہ ڈال کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

شبانہ نے ٹھنڈی سانس بھری، "چچی میں نے تو زندگی کی لگام جب بھی اپنے ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی ہے، اس نے سرکش گھوڑے کی طرح مجھے صحرا میں رلایا ہے۔"

"جوانی بھی ایسی ہی ہے وہ بھی کبھی کبھی صحرا میں رلا دیتی ہے، لیکن پھر بھی اس کی موج ٹھنڈے پانی کی طرح ہوتی ہے۔" رفعت نے قریب ہو کر اس کا ہاتھ پکڑا، "دیکھو شبانہ! اس جوانی کی قیمت، وقت کے ساتھ سکے کی طرح کم ہوتی جاتی ہے۔ اب ایک روپیہ تو بچے بھی نہیں لیتے۔ یہی ایک روپیہ تھا، جس کے لئے میرے دادا مجھے بتاتے تھے کہ، اس سے ایک ٹن گندم خریدتے تھے۔ گھر کا بہت سا سودا سلف آتا تھا۔ تمہارے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں، اس لئے جوانی کی قیمت کو کچھ اہمیت دو۔"

شبانہ رفعت کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے اور گالوں کے پاس جلد کافی سانولی ہوگئی تھی۔ جیسے چوٹ کے نشانات ہوں۔ حلقے پڑی آنکھوں میں نہ کشش تھی اور نہ ہی وہ

خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس کے گال لٹک آئے تھے۔ اس کا جسم ہوا سے خالی، ٹیوب جیسا تھا۔ جس پر کپڑے پہنے ہوئے نہیں، رکھے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ شبانہ کو کہیں سے بھی کشش نظر نہیں آئی۔ اسے سمجھ آ گئی کہ سلطان اب اس کی طرف مائل کیوں نہیں ہو رہا۔

"میرا اس سے پرانا تعلق ہے، وہ مشکل اوقات میں میرے کام آتا رہا ہے۔ کسی اور کے پاس اس لئے نہیں جانا چاہتا کہ تھوڑا ڈرپوک بھی ہے اور اسے کسی دوسرے پر بھروسہ بھی نہیں۔" رفعت شبانہ کو وضاحت سے سمجھانے لگی۔

"اس کی بیوی نہیں ہے کیا؟" شبانہ کو خود ہی سمجھ نہیں آیا کہ اس نے یہ کیسا سوال کیا ہے۔

رفعت نے زوردار قہقہہ دیا، "وہ تو مجھ سے بھی گئی گذری ہے۔ عورت بچے پیدا کرنے میں اپنی جوانی اور بدن کی طاقت دے دیتی ہے۔ اور مرد کی بھوک مر کر ہی ختم ہوتی ہے۔" اس نے شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "جوانی کو سنبھالنا ایسا ہی مشکل ہے، جیسے مصری کو پانی میں گھلنے سے بچانا۔"

شبانہ رفعت کے لہجے اور آنکھوں سے سمجھ گئی کہ اسے اپنی بیتی ہوئی جوانی بہت ہی یاد آ رہی ہے۔ وقت کے ہاتھوں چھینی ہوئی جوانی اس کے لئے افسوس کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اس کی ساری باتیں، اس کے قہقہے ایسے خالی اور کھوکھلے تھے جیسے پرانی لکڑی کو اندر سے دیمک لگی ہوئی ہو۔

"کیا کہتی ہو؟" واپس اسی موضوع پر آتے ہوئے رفعت نے اس سے پوچھا۔

"آپ کو دیکھنے کے بعد میرے لئے بہت مشکل ہے، میں بھی تو آپ کے لئے سنبل جیسی ہوں نا!" شبانہ نے اسے حیران کر دیا، "سلطان کے علاوہ جس کے لئے بھی کہیں گی، میں انکار نہیں کروں گی۔"

رفعت نے خاموشی سے گردن جھکا دی۔ چائے لانے کا کہہ کر اٹھ کر چلی گئی۔ شبانہ تنہا ہوئی تو اس کی کیفیت میں ایک دفعہ پھر اداسی چھاگئی۔ اس نے سوچنا چاہا، لیکن خود ہی سوچ کے دروازے بند کرنے لگی۔ خدا حافظ کہے بنا گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ واپسی پر وہ خیالوں میں اتنی گم تھی، جیسے وہ ان راستوں پر چل کر گھر نہ پہنچی ہو بلکہ ان راستوں نے اسے گھر پہنچایا ہو۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو رحیم داد چارپائی پر الٹا سویا ہوا تھا، شبانہ کی اس کے کروٹ لئے چہرے پر نظر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے اسے لگا کہ یہ تو کوئی لاش ہے۔ منہ کھلا، آنکھیں ایک جگہ پر ٹکی ہوئیں۔ وہ پوری لرز گئی۔ شبانہ ڈرتی ہوئی اس کے پاس آئی اور بازو سے پکڑ کر پکارنے لگی۔ "بابا! او بابا!"

رحیم داد نے کراہتے ہوئے سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ لیکن سیدھا نہ ہو سکا۔ شبانہ نے سکون کی لمبی سانس بھری، "کہاں چلی گئی تھی؟ کتنی دیر سے بھوکا پڑا ہوا ہوں۔" نشے میں ڈوبے ہوئے لہجے سے کہا۔

شبانہ نے مزید کچھ نہیں کہا، کھانا لا کر باپ کو دیا، جو ٹانگوں سے زخمی بکرے کی طرح کراہتے ہوئے سیدھا ہو کر چارپائی پر بیٹھا۔ شبانہ اسے کھانا اور پانی دے کر کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کا باپ نشے اور جوا کی عادت سے جان چھڑا سکے۔ اچانک اسے اپنے متعلق بھی ایک خیال ذہن میں ابھر آیا:

کہیں میں بھی تو مردوں کی عادی نہیں ہو رہی ہوں۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ مجبوری کی وجہ سے ہوا ہے۔ صرف میں ہی ایسی ہوں کیا۔۔۔!

اس نے ذہن میں آئے ہوئے اس خیال کو جھٹک دیا اور آنکھیں بند کر کے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کی پلکیں بھی اس کے روح کی طرح گیلی ہو گئیں۔

☆☆☆

گلزار کا کیس کسی نتیجے پر نہیں پہنچا اسے حادثہ قرار دیکر ختم کیا گیا۔ پولیس کے دو ہزار روپے شبانہ نے رفعت کی مدد سے پندرہ قسطوں میں ادا کیئے۔ ایس ایچ او اور ہیڈ کانسٹیبل نے "خصوصی رعایت" کرتے ہوئے کم پیسے لئے تھے۔

رحیم داد نے شبانہ کو دوسری شادی کے لئے قائل کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ خود بھی سمجھ نہ سکی کہ اس نے انکار کیوں کیا ہے۔ اسے دلہن بن کر باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر جانے کی خواہش تو ہوتی تھی لیکن گلزار کے مرنے کے بعد اسے یہ آس بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے اگر دلہن بن کر کسی کے گھر جانا چاہا تھا تو وہ صرف جمیل تھا۔۔۔ اس کے من میں انتظار تھا، جسے وہ سمجھ نہ سکی تھی۔

اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ جمیل کسی بھی طرح اس سے شادی نہیں کرے گا۔ اس کی پہچان ایک ایسی لڑکی کے طور پر ہونے لگی جس سے ملنے کے لئے لو کو شیڈ کے لڑکے تڑپنے لگے تھے۔ لیکن بہت سے اس سے ڈرتے بھی تھے۔ سہیل کو سرعام کوٹنے والا واقعہ کوئی بھی نہیں بھولا تھا۔ کافی وقت سے سہیل اسے نظر بھی نہیں آیا تھا۔ پراسرار طور پر سہیل کا اس سے سامنا نہ ہونا اسے سوچنے پر مجبور کرتا تھا لیکن وہ اس پر زیادہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ شبانہ کو کوئی 'بدنام' کہنے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ پورے محلے میں کانا پھوسی بھی بڑھ گئی تھی۔ اسے وہاں سے نکالنے کی باتیں بھی ہوئیں لیکن اس سے ایسا کہنے کی ہمت کسی کو بھی نہ ہوئی۔ اس کا باپ جب بھی کسی 'مہمان' کو لاتا تھا تو وہ کمرے کی چار سو چوالیس اینٹیں گنتی رہتی تھی۔ باپ اسے پچاس یا سو روپے دیتا تھا۔ یہ خطرہ اس کے باپ نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ محلے میں اعتراضات شروع ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے بے غیرتی کے طعنے تو خوراک بن گئے تھے لیکن شبانہ سے ایسے موضوع پر بات کرنے سے ڈرتا تھا۔ شبانہ نے بھی مردوں کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا۔

اس نے اپنے گھر کی قطار میں رہنے والے کوارٹروں میں سے مجید، قدرت اللہ اور کچھ

دوسرے کلاس فور کے ملازمین کو ایسا اسیر بنا دیا تھا کہ ان کے گھروں میں جھگڑے فسادات شروع ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ان کوارٹروں میں صرف تنہا مرد ہی رہ گئے تھے اور کنبے دوسرے کوارٹروں کی طرف چلے گئے تھے یا دور دور پلاٹوں پر قبضہ کر کے گھر بنا لئے تھے۔ کلاس فور کے ملازمین اس کے پاس 'مہمان' بن کر آنے لگے۔ شبانہ کی زندگی کے پیڑ سے کیفیتوں اور احساسات کے پتے جھڑ گئے تھے۔ وہاں لوگوں کو لذتوں کے میواجات مل رہے تھے اور اس کے لئے وہ لمحے زلزلے ہوتے تھے، وہ خزاں کے درخت جیسی ہو گئی تھی۔ جس پر اب پرندوں کے گھونسلے، پتوں سے ڈھکے ہوئے نہیں تھے۔

جون کا مہینہ لوٹ آیا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا، یقیں کرنے کے لئے وہ ریل کی پٹری تک گئی۔ کڑکی دھوپ تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل پٹری کے پاس بیٹھی، نیچے جھک کر کان پٹری پر رکھا، گرم پٹری کان کو لگی تو چونک کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں اطراف نظر گھمائی، شدید گرمی کے سبب پٹری کی دونوں جانب ویرانی چھائی تھی۔ اس کے کپڑے پسینے سے گیلے ہو گئے تھے، مال گاڑی گذری تو اس کی ہوا، اسے سکون دینے لگی۔ اسے یقین ہوا کہ یہ اس کا خواب نہیں تھا۔ اسی سکون کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ اچانک جمیل اس کے کمرے میں آیا تھا۔ اسے اتنا کہہ کر چلا گیا تھا، "شام کو ریلوے لائن کراس کر کے مین روڈ پر آنا۔" یہ کہہ کر وہ ایسے گم ہو گیا، جیسے آیا ہی نہ تھا۔ شبانہ تھوڑی دیر کے لئے وہیں کھڑی رہی۔ گرمی لگنے کی وجہ سے وہ واپس روانہ ہوئی۔ روڈ پر اس نے موٹر سائیکل کی آواز سنی لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گرمی کی وجہ سے راستے ویران تھے۔ اکا دکا لوگ گذر رہے تھے لیکن ان کے سروں پر تولیہ یا کپڑا تھا۔ خود سے بیزار، کسی کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔

اسے یاد ہی نہیں تھا کہ اس کی کتنے مردوں کے ساتھ روایتی ملاقاتیں ہوئی ہیں، لیکن کوئی بھی تو ایسا نہیں تھا جو اسے یاد رہتا ہو ماسوائے جمیل کے، جس نے اس کے روح کی گھنٹی بجائی

تھی اور دوسرا سہیل جس نے اس کے روح پر کھرونچیں لگائی تھیں اور اس کی زندگی کو کبھی نہ بھرنے والے زخم دیئے تھے۔

آخر شام کیوں نہیں ہو رہی، وہ کمرے میں پھرتی رہی۔ باہر راستے پر گھومتی رہی۔ جون کا لمبا دن، اس کی شدت کو مزید بڑھاوا دے رہا تھا۔ وہ اس بات پر سوچ ہی نہیں رہی تھی کہ اسے جلدی سے وقت گذرنے کی پریشانی کیوں ہے، اسے یہی فکر تھی کہ دن کا یہ حصہ ایسے کٹ جائے جیسے کوئی چرواہا کسی درخت سے کوئی ٹہنی کاٹ دیتا ہے۔

دن نے تو اپنا سفر پورا کیا، لیکن شام میں بھی وہی تپش تھی۔ شبانہ گھر سے نکلی، گھر کے سامنے جھاڑیوں کے درمیاں والے راستے سے ہوتی ہوئی ریلوے کے بند پر پہنچی، پٹریاں کراس کیں۔ سارے ٹریک کراس کرنے کے بعد دوسری جانب آبادی کے درمیان بنے راستے پر گئی۔ بچے کھیل رہے تھے، میلے کچیلے بچے دیکھ کر وہ مسکرادی، وہاں کچھ نوجوان بھی موجود تھے، جن کے فلمی انداز والے ایکشن کو نظر انداز کیا تو ان نوجوانوں نے سیٹیاں بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بے نیاز ہو کر آگے چلتی رہی۔ مردوں کا جملے کسنا اب اسے غصہ نہیں دلاتے تھے۔ وہ آبادی کراس کر کے مین روڈ پر پہنچی، جو روہڑی سے گھوٹکی کی طرف جاتی تھی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ جب وہ مین روڈ پر نمودار ہوئی تو جمیل بھی موٹر سائیکل پر پہنچ گیا۔ کچھ بات کیے بغیر اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ تھوڑا آگے چل کر جمیل نے موٹر سائیکل دریائے سندھ کے بند کی طرف موڑ دی۔ چڑھائی چڑھنے کے وقت شبانہ نے ڈر کے مارے دونوں ہاتھ جمیل کی کمر میں کس دیئے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اسے لگا کہ وہ ایسی حفاظت میں ہے جہاں خدا کے علاوہ اسے کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ کھوئی ہوئی ہی تھی کہ جمیل کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، "پہنچ گئے ہیں ہاتھ چھوڑ دو۔"

شبانہ نے ایکدم جمیل کی کمر کو بازوؤں کی گرفت سے آزاد کیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں،

وہ دریا کے بند پر تھے، پانی کی لہریں بند سے ٹکرا رہی تھیں۔ سامنے درختوں کا آدھا حصہ ڈوبا ہوا تھا، کچھ دور گھر بھی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے مغرب کی جانب نظر ڈالی، دور روہڑی کی طرف پل کا دل چھو لینے والا منظر تھا۔ سورج پل کے درمیان تھا، کشتیاں دریا میں تیر رہی تھیں۔ پانی کی لہروں کی آواز، دریا کے گیت کی طرح اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ "تم کبھی پہلے یہاں آئی ہو؟" جمیل نے جیسے لہروں سے سر ملا دیا ہو۔

شبانہ نے گردن ہلا کر انکار کیا۔

"تمہیں دریا پر اسی لئے لے آیا ہوں تاکہ تمہیں دکھاؤں بھی اور تم سے ملاقات بھی کرلوں۔ اب تمہارے گھر میں ملنا آسان نہیں۔ پتا نہیں آج کیسے موقع مل گیا۔ شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں۔" جمیل نے شبانہ کو دیکھے بغیر لہروں کو گھورتے ہوئے کہا۔

شبانہ حیرت کے دریا میں ڈوب گئی۔ بہت عرصے کے بعد جمیل آیا تھا اور وہ اس سے اس کے گھر میں ملنے کو عیب سمجھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں سوال اٹھا۔ "لیکن کیوں؟!" لیکن کہہ نہ سکی۔

دن کو تو سورج جانے کا نام نہیں لے رہا تھا، لیکن شام کو اچانک دریا میں گر گیا جس کی وجہ سے مغرب کی طرف دریا کا رنگ نارنجی اور سرمئی ہو گیا۔

جمیل نے شبانہ سے اپنے متعلق بہت باتیں کی۔ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ اب وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ہے۔ کچھ سال بعد کسی اسٹیشن پر سپرینڈنٹ بھی ہو گا۔ اس نے اسے جھمپیر، جیکب آباد، ہیڈ کوارٹر اور پڈعیدن میں اپنی پوسٹنگ کے قصے بھی سنائے۔ شبانہ کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس دوران وہ دریا کی لہروں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کا من بھی لہر لہر تھا۔

"تم نے شادی کر لی ہے۔۔۔؟" آخر بیزار ہو کر شبانہ نے سوال کیا۔

جمیل کے لئے یہ ایسا اچانک سوال تھا کہ اسے لگا جیسے کسی نے دھکا دے کر اسے دریا میں گرانے کی کوشش کی ہے۔

"تم کیا جانتی ہو؟" جمیل نے جواب دینے کی بجائے شبانہ سے پوچھا۔

" یہی کہ چچا کریم بخش تمہاری شادی اپنے بھائی کی معذور بیٹی سے کروانا چاہتا تھا۔ اسے تم سے زیادہ اپنی بھتیجی کی فکر ہے۔" شبانہ نے اسے بتایا۔ "لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟ دوبارہ پوچھ رہی ہوں تم نے شادی کر لی ہے نا؟"

جمیل نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "تمہیں کیا لگ رہا ہے کہ میری شادی ہوئی ہے!"

"تمہارا جسم بتا رہا ہے۔" شبانہ نے مسکرا کر کہا لیکن اس کے اندر درد کی لہر دوڑ گئی۔

"کیا مطلب؟!" جمیل نے مزید حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"چھوڑو نا اس بات کو۔ بتانا ہے تو بتاؤ، نہیں بتانا تو بھی تمہاری مرضی۔" شبانہ نے بے تکلفی سے کہا۔

عام طور پر بھی شبانہ کا بات کرنے کا انداز بے تکلف ہو گیا تھا۔ با گڑی یا اونچا بولنے والی کچھ دیہاتی عورتوں کی طرح سوال جواب کر کے وہ مردوں کو پریشان کر دیتی تھی۔ اس کے ایسے بے تکلفانہ انداز کی وجہ سے دو تین لوگ گھبرا کر بھاگ گئے تھے۔ جیسے ان کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ ایسے مردوں پر ان کے بھاگ جانے کے بعد بہت ہنستی تھی۔

"ہاں کی ہے۔" جمیل کا مختصر جواب اس کے کانوں تک ایسے پہنچا، جیسے پانی کی بڑی لہر بند سے ٹکرائی اور بند کے کنارے سے مٹی کا ایک تودا پانی میں گر گیا ہو۔ "لو کو شیڈ میں تمہارے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ پڈ عیدن میں شادی کر لی ہے۔"

"ک۔۔۔ب۔۔۔ کیسے؟" الفاظ شبانہ کے گلے میں مچھلی کے کانٹے کی طرح پھنس گئے۔

"شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ ایک بیٹا بھی ہے۔ سمیر نام رکھا ہے اس کا۔" جمیل نے آہستگی سے کہا۔ جمیل نے محسوس کیا کہ یہ بات کرتے ہوئے اسے لگا جیسے اس نے کوئی چوری کی ہے، جس کا اسے پچھتاوا ہے۔ تھوڑی دیر گردن جھکانے کے بعد اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "اس لئے یہاں نہیں آتا۔ جب تک بابا زندہ ہے، کوشش کروں گا کہ کم آؤں، جب بھی آتا ہوں اسے بس شادی کی ہی فکر ہوتی ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے کہا ہے کہ جب تک کسی اسٹیشن پر سپریڈنٹ نہیں ہو جاتا شادی نہیں کروں گا۔"

شبانہ خاموش ہوگئی، جمیل بھی خاموش ہوگیا۔ شبانہ جمیل کو وہیں چھوڑ کر واپس روانہ ہوگئی۔ جمیل اسے روکنا چاہتے ہوئے بھی، نہیں روک پایا۔ وہ اسی راستے سے واپس گھر پہنچی۔

شام ہونے کے بعد لوکوشیڈ میں گہما گہمی بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کی گفتگو کی آوازیں، ہوٹلوں پر بجتے گانے، ٹھیلے والوں کی آوازیں۔ جیسے آوازوں کا میلہ شروع ہوگیا تھا۔ لیکن شبانہ کو ہر طرف خاموشی ہی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

شبانہ کے جانے کے بعد جمیل نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی، اسے لگا کہ اس کے پاؤں اتنے وزنی ہوگئے ہیں کہ اٹھا نہیں سکتا۔ موٹر سائیکل کی کک پر پیر رکھا تو سلپ ہوگیا اور اسے ٹخنے پر کھرونچ آگئی۔ آج اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس سے زیادہ کھرونچ اس کے دماغ کو آئی تھی۔ وہ اپنے خیالات سے شبانہ کو الگ نہ کر سکا تھا۔

☆☆☆

خوبصورتی بھی ایمان کی طرح ہوتی ہے۔ شبانہ کی ماں مرتے دم تک جس بات پر قائم رہی اس سے ذرہ برابر بھی نہ ہٹی۔ شبانہ کا حسن بھی، اس کی ماں کے ایمان کی طرح تھا۔ وہ، جو

صدمے برداشت کر رہی تھی، ایسے صدموں میں حسن تو کیا، زندگیاں بھی گل جاتی ہیں، لیکن اس کے حسن میں کیا عجیب طاقت تھی کہ لوگ اسے لوکوشیڈ میں حسیناؤں کی اونچی ناک سمجھتے تھے۔ ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی ناک کاٹنے یا کٹوانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ شبانہ بھی جانتی تھی کہ ایسے لوگ ہر شہر، گاؤں اور محلے میں ہوتے ہیں۔ شدید گرمیوں کی وجہ سے لوگوں کی بات کی شروعات ہی اس طرح ہوتی تھی، " یار بڑی گرمی ہے۔"

گرمیاں ہوں چاہے سردیاں، شبانہ اپنے ہاں آنے والوں کی ایسی باتیں سنتی رہتی تھی، موسم تو ہر مرتبہ وہی ہوتے تھے، لیکن لوگوں میں تبدیلیاں آرہی تھیں، بچے جوان ہو رہے تھے، جوان بوڑھے ہو رہے تھے، آبادی اور گھر بڑھتے جا رہے تھے۔ عمارتوں کی طرح مردوں اور عورتوں کی جسامتیں پرانی ہو رہی تھیں۔ نئی نئی چیزیں لوگوں کے استعمال میں آرہی تھیں۔ ایسے ہی شبانہ کے ہاں بھی نئے نئے لوگ آنے لگے۔ ریلوے میں تبادلے سے آنے والے ہوں، یا لوکوشیڈ میں کرائے دار کی حیثیت میں رہنے والے ہوں۔

شبانہ نے شام کو کمرے میں گھٹن محسوس کی تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنے کمرے کا روشندان کھولے۔ اس نے صندوق کے اوپر کرسی رکھی۔ روشندان اس کے گھر کی پچھلی طرف کھلتا تھا۔ چار پانچ سال سے نہیں کھلا تھا۔ صندوق کے اوپر اس کے میلے کپڑے بھی پڑے تھے۔ اس نے جیسے ہی روشندان کا پلہ کھولنے کے لئے ہاتھ ڈالا تو وہاں بنے ہوئے گھونسلے سے چڑیائیں اڑنے سے اسے ایسا جھٹکا لگا کہ چیختے ہوئے گرتے گرتے بچ گئی۔

اس کی چیخ کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اس نے گھونسلہ ہٹانا چاہا، کوئی خیال آنے پر اس نے گھونسلہ وہیں رہنے دیا۔ اس نے روشندان کھولا باہر سے گرم ہوا آئی تو کمرے میں تازگی بھی آگئی۔ سامنے دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو گئی تھی اور ابھی ٹھیک سے نیچے اتری بھی نہ تھی کہ

روشندان کی پرلی طرف سے شور آنے لگا۔ بچوں اور عورتوں کی آوازیں شامل تھیں۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ روشندان پھر سے بند کردے یا کھلا رہنے دے۔ اسی سوچ میں تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

دستک کی آواز سے اس کی سوچ منقطع ہوگئی اور چھلانگ لگاکر صندوق سے اتر کر دروازے کے پاس آئی، جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے چالیس برس کا ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا، اس نے جیسے ہی شبانہ کو دیکھا اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ "بولو کس سے ملنا ہے۔"

آدمی کو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ شبانہ نے دوبارہ پوچھا، "بتاؤ کیا کام ہے؟ اندر آنا ہے تو اندر آؤ، نہیں تو جاؤ۔"

"گھر میں کوئی مرد ہے؟" اس نے تھوڑا ترش لہجے میں کہا۔

شبانہ سمجھ گئی کہ وہ کسی اور کام کے لئے آیا ہے، "کیوں کیا کام ہے؟"

"پیچھے ہمارا گھر ہے، روشندان کس نے کھولا ہے؟" اس آدمی نے بڑی ہمت جمع کرکے بات کی۔

"کیوں؟ میں نے کھولا ہے؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" شبانہ نے کڑکدار آواز سے جواب دیا۔

اس شخص نے اپنے لہجے کو گرمی کی طرح گرم ہونے نہیں دیا، "پیچھے ہمارا گھر ہے، مناسب نہیں کہ آپ کی آوازیں ہم تک اور ہماری آوازیں آپ تک پہنچیں۔"

"ٹھیک ہے، آوازیں تو لوگوں کی ہیں، لیکن ہوا آپ کی ہے کیا؟ گرمی نہیں دیکھ رہے۔" شبانہ نے بھی لہجے میں نرمی دکھائی۔

وہ شخص شبانہ پر ایک نگاہ ڈال کر مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس شخص کو باریک کپڑے پہنے ہوئے تھے، بالوں میں کنگھی کی ہوئی نہیں تھی۔ شبانہ واپس ہوئی، کمرے میں جانے کی

بجائے برآمدے میں بیٹھ گئی۔ چارپائی پر لیٹی تو اسے نیند نے گھیر لیا۔

وہ گہری نیند سے جاگی، کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولی، رات چھا گئی تھی۔ قریباً آدھی رات تھی۔ اس نے سمجھا کہ اس کا باپ آیا ہے۔ اس نے چپل پہنتے ہوئے آواز دی، "رکو! آ رہی ہوں۔"

اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے شام میں آنے والا شخص کھڑا تھا، جس کے چہرے پر اندر جلتے ہوئے بلب کی روشنی پڑ رہی تھی۔

شبانہ نے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اندر آنے کی التجا ہے۔ وہ دروازے سے ہٹ گئی اور گردن سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ شخص اندر آیا، اس نے دروازہ بند کیا۔ برآمدے میں خود چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس شخص کو لکڑی کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات تپش کو دھکیل کر دور کر چکی تھی، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

شبانہ نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر کوئی خوف نہ تھا۔ "بتاؤ کیسے آنا ہوا؟" شبانہ نے آنکھیں ملتے اور جمائی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ شخص اس کے جسم پر نظر ڈال کر مسکرا دیا۔ شبانہ سمجھ گئی کہ اس کی مسکراہٹ میں کیا جواب ہے اور کیا سوال، "کیا کرتے ہو؟ پہلے یہاں دیکھا نہیں تمہیں؟ شبانہ نے یکمشت دو سوال کیئے۔

"گدھا گاڑی چلاتا ہوں سکھر میں نیو پنڈ میں رہتا تھا، بھائیوں سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں سے یہاں نقل مکانی کر کے آیا ہوں۔" اس نے مختصراً اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"یہاں کب منتقل ہوئے؟" شبانہ کو وہ شخص دلچسپ لگا۔

ہفتہ ہوا ہے۔ اس گھر کے پیچھے کرائے پر جگہ لی ہے۔"

"ہوں!" شبانہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسے آنا ہوا؟" شبانہ کو لگا کہ اس نے یہ سوال ایسے ہی کر دیا ہے۔

"تم تو بڑی انجان بن رہی ہو کہ کیوں آیا ہوں؟" اس شخص نے ہلکا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

شبانہ نے اس کے لہجے سے بھانپ لیا کہ اس شخص نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ اس نے اس کا جائزہ لیا۔ پاؤں میں چپل پہنی ہوئی تھی، لنگوٹ کے ساتھ سفید رنگ کی باریک قمیض پہن رکھی تھی۔ جو دھلی ہوئی نہیں تھی۔ وہ شخص مضبوط جسامت والا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور بھویں گہری تھیں۔ بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی۔

وہ جب صبح سویرے جانے لگا تو ہنستے ہوئے پوچھا، "تم میرا نام نہیں پوچھ رہی ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔" اس نے شبانہ کو اپنا نام بتانا چاہا تو شبانہ نے ایکدم سے اپنی بات کہہ دی، "نام ان سے پوچھتی ہوں جو میری زندگی کا حصہ بنتے ہیں یا پھر ستاتے ہیں۔ باقی پچاس سو روپے دے کر جانے والوں سے نام پوچھ کر کیا کروں گی۔"

"میرا نام شمس الدین ہے۔" شبانہ نے بات ختم کی تو اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا، "میں چاہتا ہوں کہ تم میرا نام یاد رکھو، میں تم سے دور نہیں جاؤں گا۔"

شبانہ کو شمس الدین کی یہ بات اچھی لگی، مسکراتے ہوئے اسے کہا، "شمس الدین ہو یا شمش الدین۔ شمسو ہو یا سمسو، یہ تو وقت بتائے گا کہ تم کتنے دور اور کتنے پاس رہو گے۔ فی الحال تو جاؤ، صبح ہونے والی ہے۔" شبانہ نے بے تکلفانہ انداز سے اس کے سینے پر دائیں ہاتھ سے دھکا لگا کر کہا۔

شمس ہلکا قہقہہ لگاتا ہوا باہر چلا گیا۔

☆☆☆

شمس الدین کی اولاد میں سات بچے تھے، تین بیٹے اور چار بیٹیاں۔ اس کے بڑے بیٹے کی عمر قریباً اکیس برس تھی۔ وہ سارہ دن گدھا گاڑی چلاتا تھا۔ روزانہ تین چار سو کما لیتا تھا۔ مضبوط جسامت کے باعث اناج اور کھاد اٹھانے کے گاہک زیادہ ملتے تھے۔ اس کا بیٹا بھی ساتھ ہوتا تھا، اس لئے اس کا کام اچھا چل رہا تھا۔ بھائیوں سے جھگڑے کی وجہ سے وہ وہاں سے نقل مکانی کر کے لوکو شیڈ میں آ کر بسا تھا۔ اس کی بیوی اکثر بیمار رہتی تھی۔ خاموش طبع تھی۔ اس کی بیٹیاں ہی گھر کا سارا کام کاج کرتی تھیں۔ یہ اس کی بیوی بھی جانتی تھی کہ شمس الدین محض اس کا نہیں ہے لیکن وہ دوسری عورتوں سے بھی ملتا ہے۔

شمس الدین کے لئے شبانہ بالکل نئے انداز کی عورت تھی۔ اسے کبھی شوخ لڑکی لگتی تھی تو کبھی تجربہ کار عورت۔ دونوں صورتوں میں اس کا جوبن اور حسن دونوں ہی لاجواب تھے۔ شمس تو اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔

ایک رات اس نے شبانہ سے کہا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور سے نہ ملے جس کے بدلے وہ اپنی کمائی کی آدھی رقم روزانہ شبانہ کے ہاتھ پر رکھنے لگا۔ شبانہ مذاق میں اسے کہنے لگی، "میں کونسی تمہاری بیوی ہوں جو روزانہ مجھے پیسے دو گے۔" وہ رات میں شبانہ کے پاس آئے یا نہ آئے لیکن پچاس سو روپے شبانہ کو ضرور دیتا تھا اور کبھی کبھی بازار سے اس کے لئے کوئی کھانے پینے کی چیز بھی لے آتا تھا۔ اگر شبانہ گہری نیند میں سوئی ہوتی تھی اور دروازہ نہیں کھولتی تھی تو وہ دیوار پھلانگ کر بھی اس کے پاس آتا تھا۔

رحیم داد کو اس کی بھنک پڑ گئی تھی۔ اس نے شبانہ پر زور دیا کہ اسے ہر حال میں حصہ چاہئے۔ شبانہ باپ کو کچھ نہ کچھ پیسے دے دیتی تھی۔ شبانہ کو بھی گھر میں رونق کا احساس ہونے لگا۔ شمس اس کے ہاں آ کر شراب بھی پینے لگا۔ وہ کچی شراب پیتا تھا۔ اس نے مذاق میں ایک دن شبانہ

کو بھی چکھایا، شبانہ نے بھی پی لیا اور ایسے بات آگے بڑھتی گئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ کچی شراب پینے لگی۔ ایسے تعلقات چھپ کیسے سکتے تھے۔ شمس کے گھر والوں کو پتا چل گیا۔

ایک دن ماں کے کہنے پر اس کی بیٹیاں کسی بہانے شبانہ کے گھر آکر اسے دیکھ کر گئیں اور ماں سے اتنی تعریف کر دی کہ وہ بچاری سہم گئی اور اسے لگا کہ کہیں شمس اس سے شادی نہ کر لے۔ نشہ میں وہ بیوی کو بتا چکا تھا کہ وہ شبانہ کو خرچہ دیتا ہے، اس لئے اس پر اس کا حق ہے۔ لیکن جب اس نے شوہر کو پاک کتاب کا واسطہ دیا کہ وہ شبانہ سے شادی نہیں کرے گا تو شمس نے بیوی کو ڈانٹ پلا دی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یتیم ہے، تنہا ہے، وہ اس کی مدد کر رہا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ عورت تھی اس لئے شوہر کی ایسی لفاظی کو اہمیت دیئے بغیر روزانہ اس سے احتجاج اور جھگڑا کرتی رہی۔ رات میں شمس کہیں شبانہ کے پاس نہ چلا جائے اس لئے رات بھر جاگنے لگی۔ اس کی آنکھیں ایسی مکھیاں تھیں جو شوہر کے چہرے کو چھتہ بنا چکی تھیں۔

شمس نے اس کا بھی حل نکال لیا۔ وہ اب دن میں شبانہ کے پاس آنے لگا۔ شبانہ اسے دن میں باہر مین روڈ پر رکنے کا کہتی تھی اور لوکو شیڈ سے نکل کر وہاں پہنچتی تھی۔ دونوں ساتھ میں گھومنے کے لئے نکل جاتے تھے۔ کبھی دریا پر چلے جاتے تھے۔ ایک ایک ہو کر چھپتے شبانہ کے گھر آتے تھے۔

سکھر میں ان کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک گراؤنڈ میں لگا سرکس دیکھ رہے تھے۔۔ سرکس کے اس حصے میں بیٹھے تھے جہاں بھوسہ رکھا ہوا تھا۔ اس لئے دونوں نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی طرح اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جن میں عورتیں بھی تھیں۔ سرکس میں کرتب دکھائے جا رہے تھے۔ شبانہ کی زندگی کے وہ لمحے یادگار تھے۔ وہ ایسی تفریح کے لئے پہلی بار نکلی تھی۔ ایک بڑا تختہ لایا گیا۔ تنگ کپڑے پہنے ایک لڑکی اس تختے کے سامنے آئی اور اسے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ چاندی جیسی چمکتی ڈریس کی طرح اس کے ہونٹوں پر بھی چمکتی تبسم

تھی۔ اس نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔

سامنے ایک درمیانی عمر کا شخص ناچتے کودتے ہوئے آیا۔ اس نے اسپورٹس ٹراوزر اور سرخ رنگ کی ٹائیٹ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں جوگر پہنے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ایک اور نوجوان لڑکی آئی، وہ بھی کسرتی بدن والی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں ایک درجن چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایسی چمکتی چھریاں جیسی اس لڑکی کی آنکھیں، جو تختے پر ٹیک لگاکر کھڑی تھی۔ اس شخص نے اپنے مخصوص انداز سے اس کی طرف چھری پھینکی جو لڑکی کے دائیں بغل کے پاس جاکر تختہ پر لگ گئی۔ دوسری دفعہ اس کے بائیں طرف، اس طرح اس کے سر سے پاؤں تک اس نے چھریاں پھینکی جو اس کے جسم کے قریب تختے میں پیوست ہوئیں۔

شبانہ اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر ایسے خیالات میں چلی گئی جیسے وہ چھریاں اس کی طرف پھینکی جارہی ہیں، کوئی ایسی چیز ہے جو نہ فقط اسے چھریوں سے بچارہی ہے، بلکہ ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی برقرار رکھ رہی ہے۔

ہر طرف سے چھریوں کی بارش ہے لیکن وہ بے پرواہ ہے۔

ہال میں تالیاں بجنے لگیں۔ شبانہ نے بھی اس عورت کی طرح تالیاں نہیں بجائیں جس کے ہاتھوں میں چھریوں والی پلیٹ تھی یا جس کی طرف چھریاں پھینکی گئی تھیں۔ شبانہ حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی۔ تاوقت کہ اس نے گالیوں اور مکے مارنے کی آوازیں سنی۔ مڑ کر دیکھا تو پانچ چھ لوگ شمس کی پٹائی کررہے تھے جن میں اس کا بڑا بیٹا بھی شامل تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی شبانہ کو کچھ نہیں کہا، شمس کو گھسیٹ کر لے گئے۔ شمس کے بیٹے کے ساتھ دوسرے تین لوگ اس کے ماموں تھے۔ شبانہ بوکھلائی ہوئی کھڑی رہی۔ پل بھر میں شمس کو اس سے دور کردیا گیا۔ سرکس ختم ہونے تک وہ وہیں بیٹھی تھی۔ لیکن اس دوران سرکس میں دوسرا تماشہ کون سا ہوا وہ اس سے بے خبر تھی۔ لوگوں نے نکلنا شروع کیا۔ اسے لگا کہ وہ سسئی بن گئی ہے جس کا پنہوں اس سے جدا

کیا گیا ہے۔ بہت سارے لوگوں کے درمیان ہوتے بھی اسے لگا جیسے وہ کسی صحرا میں بھٹک رہی ہو۔ سرکس سے باہر آئی۔ وہ شمس کے ساتھ تماشہ دیکھنے آئی تھی، خود تماشہ بن گئی۔

جمیل کے بعد شمس ہی تھا جس کے ساتھ اسے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ شبانہ کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ رکشہ لے کر یا سوزوکی میں روہڑی تک جائے۔ اسے اسکی فکر ہی نہ ہوئی۔ وہاں سے پیدل نکل پڑی۔ رات اس کی ہمسفر تھی۔ راستے اس کے ساتھی بن گئے۔ جب وہ لوکوشیڈ پہنچی تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ اپنے گھر کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔ گھر پر نگاہ ڈالی جیسے ویرانے میں کوئی صدیوں پرانی اداس جگہ تھی، جس پر انسانی تاریخ اور وقت کا بھاری وزن رکھا ہوا ہو۔

اسے اپنے گھر کے پیچھے جانے کی خواہش ہوئی جہاں شمس رہتا تھا۔ لیکن وہ اس طرف نہیں گئی۔ بس اس طرف صرف نگاہ ڈالی۔ اندھیرے اور خاموشی نے اس کی نگاہ کو موڑ دیا۔ گھر آئی تو اس کا باپ سویا ہوا تھا، وہ بھی جاکر چارپائی پر لیٹی، لیکن نیند اس سے بہت دور کھڑی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر نیند کو پکارتی رہی، وہ اس کے پاس تب آئی جب اس نے اسے پکارنا بند کیا۔

شبانہ نیند سے جاگی تو روشنی ہی روشنی نے اس کا استقبال کیا۔ ایکدم چارپائی سے اٹھ بیٹھی۔ یہ اس کا وہم تھا یا فکر، وہ جلدی سے باہر آئی۔ گدھے گاڑیوں پر لدا سامان جا رہا تھا۔ شمس گھر خالی کرکے اپنے کنبہ کے ساتھ وہاں سے جا رہا تھا۔ اس نے اسے اس سرے کے پاس دیکھا جہاں سے گدھا گاڑیاں مڑ کر اس کی نظروں سے دور چلی گئیں۔

☆☆☆

یہ اس کے من کی آوارگی تھی یا بدن کی بے چینی، ایسی کیفیت میں وہ اچانک کسی نہ کسی

طرف نکل جاتی تھی۔ کبھی صدرالدین بادشاہ کی درگاہ پر لوگوں کے ہجوم میں گم ہو جاتی تو کبھی دریا پر جاکر اس بند پر بیٹھتی تھی، جہاں اسے جمیل لے آیا تھا۔ وہاں بیٹھ کر وہ خود سے ملنے کی کوشش کرتی تھی۔ آتے جاتے لوگ حیران ہوتے تھے کہ گھنٹوں وہاں بیٹھ کر کیا کرتی ہے، وہ کہتے جاتے تھے؛

"بالکل درویش ہے۔"

"گھر سے ناراض ہو کر آئی ہو گی۔"

"اس کے ساتھ کوئی دھوکا ہوا ہے۔"

"گاہک کی تلاش میں ہے۔"

کچھ تو اسے سیدھے سیدھے جملے کہہ کر گذر جاتے تھے؛

"کیا پروگرام ہے، چلیں!"

"دوست کے انتظار میں ہو کیا؟"

"دریا میں چھلانگ لگاؤ گی کیا؟"

"شوہر نے گھر سے نکال دیا ہے کیا؟"

"میرے ساتھ چلو گی؟"

وہ ایسے جملوں کے دریا میں ڈوبتی اور تیرتی رہتی تھی۔ ایسے رویوں کی لہروں میں بہتی رہی۔ اس کا دھیان صرف اپنے آپ میں رہتا تھا۔

اس کا باپ دن بہ دن کمزور ہو رہا تھا۔ اس پر دوائیوں کا خرچ ہونے لگا۔ بیمار باپ پر اسے ترس آرہا تھا۔ روہڑی کے سرکاری اسپتال سے علاج کرواکر اسے واپس گھر لے آئی۔

شبانہ اپنی زندگی کے پچیس برس گذار چکی تھی۔ اس کے حسن و جوبن میں کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک اس کے خوش رہنے والی طاقت اس کے حسن کے لئے خون

بنی ہوئی تھی۔ ابھی اس کی خوبصورتی کی موت نہیں ہوئی تھی۔ جس طرح زندگی کے سات برس اس نے بتائے تھے، ایسی حالت میں کسی عورت کا گذارنا کسی معجزہ سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

سنبل کی سالگرہ میں سجی سنوری مسکراتی ہوئی شبانہ، سلیمان سے بات چیت کر کے جب کمرے سے باہر نکلی تو سنبل اسے پکڑ کر کونے میں لے گئی۔ سنبل دونوں کو کافی دیر سے سالگرہ سے غائب دیکھ کر سوچ بیچار میں تھی۔ شبانہ سمجھ گئی اور قہقہہ لگا کر اسے کہنے لگی، "تمہارا بھائی تو بالکل ڈرپوک ہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید مجھے گھر چھوڑنے کے لئے کہے گا لیکن وہ تو مجھے دوسروں کے گھر پہنچانے کی بات کر رہا تھا۔"

سنبل نے شرمندگی محسوس کی اور وہ اسے یہ کہ کر دوسری عورتوں کے درمیان میں لے آئی کہ چل کر کیک کھائے، شبانہ ہنستے ہنستے اس کے ساتھ آئی، کیک کے دو حصے لے کر کہا، "تمہارے بھائی کا حصہ بھی میں کھا لیتی ہوں۔ اب وہ کیک نہیں کھائے گا۔"

سنبل نے اپنی ماں کی مرضی سے شادی کر لی لیکن اس کا شوہر شادی کے دوسرے ہفتے فوت ہو گیا۔ سنبل کو بھی سسرال والوں نے مزید برداشت نہیں کیا اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر واپس آئی۔ اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلانے کے لئے وہ کبھی اپنی سالگرہ دھوم دھام سے مناتی تھی تو کبھی اپنے چھوٹے بھائی کی۔ سنبل ہی شبانہ کی ایسی سہیلی تھی جس کے سامنے وہ کپڑے کے کھلے ہوئے تھان کی طرح تھی۔ اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے ایک کمپنی میں سیلز گرل کا کام بھی شروع کیا تھا۔

شبانہ جب سالگرہ سے واپس اپنے گھر کی طرف آ رہی تھی تو اس کے وجود کا کھلا ہوا تھان

سمیٹنے کے لئے کئی آنکھیں اور ہاتھوں کے اشارے منتظر تھے تھے۔اسے اس طرح کی پیشکشوں سے عارضی خوشی کا احساس ہوا اور اسے لگا کہ وہ بے معنی نہیں ہے۔اس کے ذہن میں پورا راستہ سلیمان کی بات گھومتی رہی۔اسے عجیب قسم کا شک پیدا ہوا۔

کہیں وہ اسٹیشن ماسٹر جمیل تو نہیں؟ ہو سکتا ہے مجھ سے ملنے کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہو۔اب وہ بابو بن گیا ہے۔گھر آنے سے بھی گھبرا اتار ہا ہے۔ٹھیک ہے، اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی جلد بازی نہیں کرتی۔تڑپنے دو اسے۔اسے بھی پتہ چلے نا کہ کسی کو کیسے تڑپایا جاتا ہے۔۔۔ لیکن وہ کیوں تڑپے گا۔بس اسے ملنا ہو گا۔لیکن میں یہ کیوں سوچ رہی ہوں کہ وہ جمیل ہی ہو گا۔۔۔۔ہو بھی سکتا ہے۔

اس نے گردن ہلا کر اپنی بات کو رد کرنے کی کوشش کی۔

وہ ایسا کیوں کرے گا؟ اسے ملنا ہو گا تو خود ہی چل کر آئے گا۔اب تو اس کا باپ بھی مر گیا ہے۔

وہ ایک پیڑ کو ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

ہو سکتا ہے وہ مجھے حیران کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہو۔اس کے میرے ساتھ تعلقات حیران کن ہی تو رہے ہیں۔

تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ گھر چلی آئی۔وہ رات اس نے انتظار کی کیفیت میں گذار دی۔اس سے یہ غلطی ہو گئی کہ اس نے سلیمان سے اسٹیشن ماسٹر کا نام نہیں پوچھا۔اسے نیند بھی ٹکڑوں ٹکڑوں میں آئی۔مختلف خیالات اس کی سوچ کو بھی تقسیم کرتے رہے۔

اگر جمیل کا تبادلہ یہاں ہوتا تو وہ مجھ سے ملنے آتا۔ہو سکتا ہے بیوی کی وجہ سے ٹال مٹول کر رہا ہو۔کیا کروں سلیمان کے ساتھ جاؤں یا خود ہی جا کر جائزہ لے آؤں؟

پچھلی بات پر اسے اطمینان ہوا اور اسے فجر کے وقت جمیل کے خیالوں کی ٹھنڈی ہوا

کے ساتھ نیند آگئی۔

اسے باپ نے گہری نیند سے جگا کر کہا، "میں جا رہا ہوں۔" شبانہ کا جائزہ لے کر رحیم داد بڑابڑایا، "اور ہاں۔۔ آج رات بھی اسی طرح بناؤ سنگھار کرنا، جیسے سنبل کی سالگرہ میں کر کے گئی تھی۔ خاص مہمان آئے گا تمہارے پاس۔" رحیم داد بغیر کوئی جواب سنے گھر سے ایسے نکل گیا جیسے کوئی جواری جیتے ہوئے پیسے لے کر چلا جائے۔

اسے سنگھار تو کرنا تھا لیکن اسٹیشن پر جانے کے لئے۔ وہ جلدی میں بر آمدے سے اٹھ کر کمرے میں گئی۔ صندوق سے اچھا جوڑا نکالا، یہ اسے رفعت نے خاص مواقع کے لئے دلوایا تھا، تاکہ خاص لوگوں کے پاس جانے کے لئے اچھے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ ریلوے کے کلاس فور کے ملازمین کے علاوہ رفعت کی معرفت سرکاری ملازمین، کلرکوں، استادوں وغیرہ میں بھی اس نے جسمانی قربتیں بانٹی تھیں لیکن روحانی قربتیں جمیل کے ساتھ ہی محسوس کی تھیں یا پھر شمس الدین بھی اس کی سانس کے کچھ قریب ہوا تھا۔ فرش پر اس کی نظر پڑی تو گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ پلاسٹک کے شاپر، روٹی کے ٹکڑے، اخبار کے پرزے اور مٹی بھی تھی۔ اسے دل میں خیال آیا کہ اگر اسٹیشن پر جمیل ہی ہوا تو آج وہ اس سے بہت بے تکلف ہوگی اور اسے گھر لے آئے گی۔ اس نے جوڑا صندوق میں رکھا۔ جھاڑو لے کر صفائی کرنے لگی۔ کمرہ ایسے صاف کیا جیسے اس کی ماں کرتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ آج اپنا گھر صاف کر رہی ہے، کوئی اجنبیت بھی محسوس نہیں کی۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ، اسے یہ گھر بھی نا آشنا لگتا تھا۔

کمرے کی صفائی کرنے کے بعد اس نے بر آمدے اور صحن کو بھی صاف کیا۔ صحن میں نیم اور شیشم کے پتے جھاڑو سے ایک کونے میں اکٹھے کرتے ہوئے گنگناتی بھی رہی۔ جیسے جیسے گھر صاف ستھرا ہوتا گیا اس نے خود کو بھی صاف ستھرا محسوس کرنا شروع کیا۔ گھر کی صفائی کی، نہائی، کپڑے پہن کر سنگھار کیا اور باہر نکلی۔ جھاڑیوں کی سے دوسری جانب ریلوے بند تک پہنچی، کچھ

نوجوانوں نے سیٹیاں بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ وہ عام طور پر انہیں چھورا کہتی تھی، اس نے "چھوروں" کی جانب دیکھا اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ آج اسے درختوں کے درمیان، راستہ بھی دلکش لگ رہا تھا۔ موسم نہ گرم تھا نہ سرد۔ ہرے بھرے گھنے درخت اور ان پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی آوازیں اس کے تن من کو خوشی سے جھومنے پر اکسا رہے تھے۔ اسے خواہش ہوئی کہ اس کے ایسے پنچھی والے پر ہوں جو سب سے تیز اڑتا ہے اور اڑتے ہوئے اسٹیشن جا پہنچے۔ اس نے مسکرا کر یہ بھی سوچا کہ کیوں نہ تیز رفتار جہاز بن جائے۔ جیسے جیسے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں سے اسٹیشن قریب ہوتا جا رہا تھا، اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ خود کو ریل کی چلتی ہوئی بوگی محسوس کرنے لگی۔ انتظار گاہ کی چڑھائی چڑھ کر ریلوے برج کے پاس آئی۔ لوگوں کا وہی شور، وہی ماحول، وہی آوازوں کا مقابلہ۔ وہ دائیں طرف سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس کے سامنے انگریزوں کے دور کا تعمیر شدہ دو منزلہ دفتر تھا۔ جس کی دونوں جانب پلیٹ فارم تھے۔ اوپر والا حصہ انتہائی خوبصورت گلکاری والا تھا۔ برطانوی طرز کی یہ عمارت سو سوا سال گذرنے کے باوجود اپنی خوبصورتی کے ساتھ قائم تھی۔ وقت کی دھول اس کے لئے آنی جانی چیز تھی، بارش کے بعد یہ عمارت دھل جاتی تو چمک بھی اٹھتی تھی۔ لکڑی کا کام بھی لاجواب کیا ہوا تھا۔ انتظامیہ تو صفائی کروانا جیسے اپنا فـــــریضـــــہ سمجھتی ہی نہ تھی۔

شبانہ پلیٹ فارم پر آنے کے بعد کچھ دیر کھڑی رہی، اس نے دیکھا کہ کچھ مسافر اسے دیکھ کر مسکراتے اور کچھ گھورتے ہوئے گذر گئے۔ کلاس فور کے کچھ ملازمین جن میں چپڑاسی، کیبن مین، بکس پورٹر وغیرہ تھے، ان کے ہونٹوں پر الفاظ پھسل کر پہنچے، لیکن شبانہ ان سے انجان ہو کر اسٹیشن ماسٹر کے آفس کی جانب روانہ ہوئی۔ سامنے آنے والی ٹرین کی وجہ سے پلیٹ فارم پر گہما گہمی بڑھ گئی۔ قلی اور مسافر تیز تیز قدموں سے ٹرین کی طرف بڑھنے لگے۔ مسافر اپنی بوگیوں کی تلاش میں تھے۔ پلیٹ فارم کی بنچوں پر عورتیں، مرد اور بچے بیٹھے ہوئے تھے، کچھ لیٹے ہوئے تھے۔

کچھ نوجوانوں کی نظریں عورتوں پر تھیں تو عورتیں بھی اپنی نظروں کو بوگی بنا کر مسافروں کو بیٹھنے کی دعوت دے رہی تھیں۔ آوازیں لگانے والوں کی آواز ٹرین کے شور میں دبی ہوئی تھی۔ ٹرین کی چھک چھک چھک کی آواز کی طرح شبانہ بھی اپنے سینے میں چھک چھک جیسی آواز محسوس کرنے لگی۔

ٹرین رکی تو اترنے اور چڑھنے والے مسافروں کے مابین جیسے کبڈی کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ ہر ایک کو جلدی تھی اور شبانہ کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ آفس کے پاس پہنچی، سلیمان کے باپ رحمت نے اسے دروازے کے پاس دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا، "بٹی تم یہاں؟ خیریت تو ہے نا۔"

شبانہ جانتی تھی کہ سنبل اور سلیمان کا باپ رحمت یہاں اسٹیشن پر چپڑاسی ہے، لیکن جمیل سے ملنے کے معاملے میں سب کچھ بھولی ہوئی تھی۔ اس کے دماغ کے دریا میں جمیل کے خیال کا ہی بھنور تھا۔ "چچا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔۔ میں نہ میں۔۔۔" وہ ہڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی، جیسے ٹرین کے پہیے آہستہ آہستہ پٹری پر رک رہے ہوں، "ج۔۔۔ جمیل سے۔۔۔"

"یہاں تو اسٹیشن ماسٹر سعید صاحب ہیں۔" رحمت نے کہا، کچھ سوچتے ہوئے۔ "کیوں کوئی کام ہے؟ مجھے بتاؤ۔"

شبانہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور ایکدم وہاں سے واپس ہوئی۔ ابھی آٹھ دس قدم ہی چلی ہوگی کہ سامنے قلیوں کے مخصوص لباس میں سلیمان آ گیا۔ اس کے سر پر دو بڑے بریف کیس اور ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ سلیمان نے اسے اسٹیشن ماسٹر کے آفس کے پاس دیکھا، اس کے قریب آ کر سرگوشی سے تیز لہجے میں کہا، "بالکل بیوقوف ہو، ایسے کیسے آئی ہو صاحب کے پاس۔ ابھی تو اس سے معاملات بھی طے نہیں ہوئے۔"

سلیمان اس سے مزید کچھ کہنے والا تھا لیکن جن لوگوں کا سامان اس نے اٹھایا ہوا تھا

انہوں نے اسے جلدی سے چلنے کو کہا۔ سلیمان شبانہ کو غصے سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ شبانہ بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ واپس روانہ ہوئی۔ مایوسی کی زنجیروں نے اس کے ننھے پھولوں کے طرح کھلے اور مہکتے خیالوں کو قید کر لیا۔

اتنا شور تھا، اتنی آوازیں تھیں، لوگوں کا ہجوم، دھکم پیل، پکاریں، چبھتی انگلیاں، جملے اسے سنائی نہیں دے رہے تھے اور نہ ہی وہ کچھ محسوس کر رہی تھی۔ اسے ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ لگ رہا تھا۔ آتے وقت خوشی میں اسے خبر ہی نہ ہوئی اور اسٹیشن پہنچ گئی تھی، ویسے ہی واپسی کے وقت درد سے بھری ہوئی کہ اسے یہ خبر ہی نہ ہوئی کیسے گھر کے قریب پہنچ چکی تھی۔

مجید کے کوارٹر کے پاس سے گذری تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کوارٹر میں لے جانا چاہا تو اس سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بنا کچھ کہے وہاں سے چلی آئی اور گھر میں داخل ہوگئی۔ راستے میں کون کون تھا، کس نے کیا بولا، کیا کہا، اس کے لئے جیسے سب کچھ خالی خالی سا تھا اس کے کمرے کی طرح۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی پھر بھی کمرہ خالی رہا۔ وہ اکیلی تھی، اس کے علاوہ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ جو سانسیں لے رہی تھی اسے لگا کہ دیواروں کی ہیں، یا فرش کی، دروازے کی تھیں یا چھت کی، یا پھر ان گیارہ ٹی آئرن اور گارڈر کی تھیں۔ دماغ خالی، سوچ خالی، آنکھیں خالی، اسے لگا کہ وہ اس پٹری کی طرح ہے جس پر برسوں سے کوئی ٹرین نہیں گذری، کسی نے لال یا ہرا سگنل نہیں دکھایا، کوئی ہاتھ میں بتی لیکر بھی نہیں گذرا اور نہ ہی پانا لگا کر کسی نے پٹری کو کھٹکھٹایا ہے۔ بازگشت، خاموشی میں خود کو ڈھونڈتی رہ گئی۔ عجیب بازگشت ہے یہ بھی۔

☆☆☆

سلیمان شبانہ پر غصہ، ایسے دکھا رہا تھا جیسے وہ اس کی زر خرید غلام ہو، جس نے اس کی

مرضی کے خلاف قدم اٹھایا ہو جس کی سزا بھی بہت بڑی ہو۔

اسے فکر یہ تھی کہ کہیں شبانہ، جس کے لئے اس نے شبنم کے نام سے سوچا تھا، اسٹیشن ماسٹر سعید احمد سے مل کر تو نہیں آئی۔ اوپر سے اسے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ اس کا باپ بھی وہاں چپڑاسی ہے، اس نے شبانہ کو اندر جاتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ قیاس آرائیوں اور فکر مندی کی کئی بوگیاں اس کی سوچ کی پٹریوں پر دوڑ گئیں۔ کئی خیالات ٹرین کی آمد کے اعلان کی طرح، اس کے ذہن میں گونجتے رہے، جن میں سے کچھ تو اس کے سمجھ میں ہی نہ آئے کہ کیوں؟ اسے دن گذرنے کا انتظار تھا لیکن اس کے ساتھ باپ کے موجود رہنے کے خوف نے اسے الجھا دیا تھا۔ کیونکہ کبھی کبھی وہ رات دیر تک ڈیوٹی پر موجود رہتا تھا، خاص کر صاحب کی موجودگی کے وقت۔

شام کے پانچ بجے تو وہ اسٹیشن ماسٹر، جسے وہ ایس ایم بھی کہتے ہیں، اس دفتر کے پاس پہنچا۔ سکون کی لمبی سانس لی، اس کا باپ وہاں موجود نہ تھا۔ اس نے ایس ایم آفس کا دروازہ کھولا، سامنے اڑتالیس برس کا سعید احمد کرسی پر رکھا کوٹ پہن رہا تھا۔ سلیمان پر نظر پڑتے ہی اسے انتظار گاہ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ سلیمان سمجھ گیا کہ سعید احمد اس سے یہاں ملنے سے کترا رہا ہے۔ انتظار گاہ کے پاس کسی سے بھی ملنا اس کے لئے مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس کے آفس سے ایسے نکلا جیسے غلطی سے داخل ہو گیا تھا۔ سلیمان برج کی سیڑھیاں چڑھ کر انتظار گاہ کے پاس پہنچا۔ انتظار گاہ کے باہر اور اندر مسافر موجود تھے، قلی، عملے کے کچھ دیگر لوگ اور کچھ ریلوے پولیس کے حولدار بھی موجود تھے۔ وہاں سے تقریباً پورا اوہڑی اسٹیشن دکھائی دے رہا تھا۔ بچھی ہوئی پٹریاں، پلیٹ فارم، کھڑی ہوئی مال گاڑیاں اور ٹرینیں۔ چلتی ہوئی ریلیں اور حرکت کرتے ہوئے لوگ۔ فضا میں پھیلا ہوا کھانے کے اسٹالوں کا ہلکا ہلکا دھواں، جس کے ساتھ لوگوں کے ہجوم کی طرح مختلف کھانوں کی پھیلی ہوئی ملی جلی خوشبو۔ سب ایک نظر اور سونگھنے کے ایک حواس میں سمائے جا رہے تھے۔

سلیمان کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، سعید احمد پہنچ گیا۔ وہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ریلوے اسٹیشن کے ملازمین اور قلیوں نے اسے سلام کیا۔ انتظار گاہ کی سیڑھیاں چڑھ کر دونوں پہلی منزل پر پہنچے۔ کمرے میں جانے کی بجائے کچھ دیر برآمدے میں کھڑے رہے۔ پھر برآمدے میں بینچ کی طرح بنی ہوئی دیوار پر بیٹھتے ہوئے سعید احمد نے سگریٹ سلگایا۔ کش لگاتے ہوئے اس سے پوچھا، "اور سناؤ سلیمان! میرا کام کب کر رہے ہو؟"

"آج آپ کے پاس آفس میں کوئی آیا تھا کیا؟" سلیمان نے اپنی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔ جس کا مطلب تھا کہ کوئی عورت آئی تھی کیا۔ سعید تجربہ کار آدمی تھا، سمجھ گیا۔

"نہیں، کیوں؟" اس نے پوچھا، سلیمان کے دماغ اور سارے جسم پر سکون ٹھنڈے پانی کی طرح انڈل گیا۔ "نہیں صاحب بس ایسے ہی! میں نے سمجھا کہ ہو سکتا ہے کوئی آیا ہو۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"میں نے تم سے کیا پوچھا؟ کوئی بندوبست ہوا۔" سعید احمد نے سگریٹ کا بڑا کش لگاتے ہوئے پوچھا۔ دھواں اس کی نتھنوں اور منہ سے باہر آیا۔

"صاحب، بس سمجھ لیں کہ کام ہو گیا ہے۔ وہی شبنم! جس کی شہرت سن رکھی ہے آپ نے۔" سلیمان نے ایک قدم آگے بڑھ کر سرگوشی کی۔ "لیکن صاحب ایک گذارش ہے، مہربانی کریں میرے باپ کو کسی دوسری آفس میں بھیج دیں۔ اس کی موجودگی میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ سلیمان نے بے تکلفانہ انداز سے کہا۔

سعید احمد نے اس کے باپ کو ایسی آفس میں مقرر کرنے کا وعدہ کیا، جہاں اسے کوئی کام بھی نہیں کرنا تھا اور چاہتا تو گھر پر بھی رک سکتا۔

سعید احمد کے گھنے بال تھے، جیسے کوئی جنگلی دنبہ ہو۔ مونچھیں اور بال آدھے سے زیادہ سفید تھیں۔ سیاہ رنگ، توند نکلی ہوئی اور درمیانہ قد تھا۔ اس کی سابقہ بیوی فوت ہو چکی تھی۔ فوت

ہونے سے تین برس قبل اس نے اسے طلاق دے دی تھی۔ ایک دوسرے پر شک کرنا، دونوں میں طلاق کی وجہ بنی۔ اس کی بیوی کا خیال تھا کہ سعید احمد عیاش ہے وہ کئی عورتوں سے تعلقات رکھتا ہوا آرہا ہے۔ جبکہ اس کے شوہر کو شک تھا کہ اس کی بیوی کے دو تین آدمیوں سے تعلقات ہیں۔ پوسٹنگ کے دوران کچھ شہروں میں دونوں ساتھ بھی رہے۔ بچے بھی دونوں کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکے اور ان کی چودہ سال، دو ماہ اور سترہ دن کی ازدواجی زندگی اختتام کو پہنچی۔

سعید احمد کی بیوی بہت حد تک درست تھی کہ اس کا شوہر کئی عورتوں سے تعلق بنائے رہتا تھا۔ جس دن دونوں کی طلاق ہوئی اس دن سعید احمد نے بیوی سے اس بات پر بحث نہیں کی کہ تینوں بچے وہ اپنے ساتھ رکھے گی۔ نہ فقط یہ بلکہ طلاق کے بعد اسے اخراجات کی مد میں پیسے بھی بھیجتا رہا۔ سابقہ بیوی کے مرنے کے بعد تینوں بچے اس کے پاس تھے، جنہیں اب سنبھالنے کی ذمہ داری اس نے اپنی ساٹھ برس کی ماں اور اڑسٹھ برس کے باپ کے حوالے کی تھی۔ جو عمرکوٹ میں رہتے تھے۔

سلیمان نے سعید احمد کو بتایا کہ شبانہ بہت خوبصورت اور بھرپور پیار کرنے والی ہے۔ سودہ یہ طے پایا کہ شبانہ سعید احمد کے پاس اس کے بنگلے میں کام والی کی حیثیت سے ٹھہرے گی۔ شبانہ کے باپ کو ماہانہ پندرہ سو روپے ملیں گے۔ اگر گڑبڑ کی تو اس پر ڈیوٹی کی سختی کی جائے گی۔ سلیمان کو پکی نوکری دلوائی جائے گی۔ اسٹیشن ماسٹر سعید احمد نے سلیمان کو آج ہی شبانہ کو لے آنے کے لئے بھیج دیا۔

سلیمان اُترائی اتر کر جلدی جلدی لوکوشیڈ میں شبانہ کے گھر کے پاس پہنچا۔ شام کا سرمئی رنگ دن کے رنگ پر غالب آگیا تھا۔ اسے شبانہ کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر جان پہچان والوں میں سے کچھ حیران ہوئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اسے سنبل نے کسی کام کے لئے شبانہ کے پاس بھیجا ہو گا۔

اس دن سہیل کا دوست غفار کسی فلم میں شبنم کا نام شبو سن کر آیا تھا تو اس نے

پہلی بار اس کا نام شبو پکارتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ سلیمان چالاک شخص ہے کسی کام سے ہی آیا ہو گا۔ اس دن کے بعد آہستہ آہستہ شبانہ کا نام، شبو شبو پکارا جانے لگا۔

سلیمان نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کنڈا پکڑا تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ وہ اندر کی طرف لٹکی ہوئی پرانی چادر ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

صحن میں صبح والی صفائی کے بعد درختوں کے کچھ پتے پڑے ہوئے تھے۔ پتوں کے اوپر سے گذرتا ہوا، من میں الجھی ہوئی شبانہ تک پہنچا، جو مایوسی کے عالم میں ایسے بیٹھی تھی جیسے فوتگی کے بعد تین دن کا سوگ ختم ہونے پر چارپائی پر آ بیٹھی ہو۔ سلیمان نے اس کا نام پکار کر بلایا لیکن پہلی بار اس کا اس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ "شبانہ! شبانہ! کہاں کھوئی ہو!"

شبانہ نے سمجھا کہ باہر سے کوئی اسے بلا رہا ہے۔ سلیمان نے اس کے کندھے کو جنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "شبانہ، میں ہوں سلیمان! پہچان نہیں رہی ہو کیا؟"

اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ایسے گرے جیسے دوپٹہ نچوڑنے سے پانی کی بوندیں گر رہی ہوں۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو ان آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی۔ سلیمان کو تھوڑی دیر کے لئے حیرانی بھی ہوئی اور پریشان بھی ہوا۔ شبانہ نے چارپائی پر بکھرے ہوئے کپڑوں کی طرح خود کو سمیٹ لیا اور آنسو پونچھ کر سلیمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ "ارے سلو! تم یہاں میرے پاس! آؤ آؤ بیٹھو!" خود اٹھ کھڑی ہوئی اور سلیمان کو چارپائی پر بٹھایا۔

سلیمان اپنی بات کرنے سے پہلے اس سے آنسوؤں کا سبب پوچھتا رہا لیکن شبانہ نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ سلیمان کے بہت زیادہ اصرار کرنے پر اس نے اسے اکتا کر کہا، "میری بات مجھ تک رہنے دو نا۔ تم اپنی بات کرو۔ کس کام سے آئے ہو؟"

سلیمان سوچ میں پڑ گیا کہ وہ اس سے سعید احمد کے پاس جا کر رہنے کی بات کرے یا

نہیں۔ اسے سعید احمد کی جلدی والی بات بھی یاد تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا کام بگڑ نہ جائے۔ اس لئے سلیمان نے آخر کار سعید احمد کے پاس چل کر رہنے والی بات کہہ ہی ڈالی۔ شبانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا جواب دے۔ سلیمان اس کی منتیں کرتا رہا کہ اس کی نوکری کا سوال ہے۔ اس نے اسے یہ بھی کہا، "اس گندے کوارٹر میں پتا نہیں کیسے کیسے جن بھوتوں سے مل رہی ہو، میں تمہارا بھی بھلا چاہتا ہوں۔ صاحب کا عالیشان بنگلہ ہے۔"

سلیمان نے کھل کر اس سے بہت ساری باتیں کی، کچھ بھی مبہم یا الجھاؤ درمیان میں نہیں رکھا۔ وہ ایسے بیوپاری کی طرح باتیں کر رہا تھا جو سودا بھی خراب نہیں ہونے دیتے اور باتیں بھی صاف کرتے ہیں۔

شبانہ کا ذہن گاہکوں سے بھرے دوکاندار کی طرح الجھا ہوا تھا۔ اس لئے اس نے اسے کل تک سوچ کر بتانے کا کہا۔ سلیمان نے بہت کہا کہ سوچنا چھوڑو لیکن اس کی سوچ کا پہیہ چپکی مٹی کی کیچڑ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس لئے سلیمان سے چائے کا بھی نہیں پوچھا۔ سلیمان مایوسی کی حالت میں چلا گیا۔ شبانہ بھی اس وقت صرف مایوسی میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن دونوں کی مایوسی والی کیفیت میں فرق تھا۔

سلیمان کے جانے کے بعد اس نے اپنے آپ سے بہت جھگڑا کیا کہ آخر وہ جمیل کے لئے اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے اپنے آپ سے پہلے بھی کئی بار گفتگو کی تھی اور خود سے اعتراف بھی کیا تھا کہ جمیل کے ساتھ اس کی محبت کا رشتہ ایسا ہے جیسے کائی اور کنول کا ہوتا ہے۔

اس دن، اس نے رات کے اسی پہر حتمی فیصلہ کیا، جس پہر جمیل لاہور سے واپس آنے کے بعد پہلی بار اس کے گھر آیا تھا۔ وہ اب جمیل کو بس جمیل کی طرح ہی من میں رکھے گی۔ جب وہ اس کی زندگی کا حصہ ہو کر بھی اس کا نہیں ہو سکتا تو پھر آخر یہ کیوں اُس کے خیال اور آس میں اپنے آپ کو دریا کے بھنور میں پھنسائے۔ اس دفعہ اس نے اپنے آپ سے طے کر لیا کہ جمیل

ملے یا نہ ملے، اب وہ خود کو دریا کے کنارے کھڑی لاوارث کشتی جیسا بنا دے گی۔

☆☆☆

وہ دو دن تک دروازہ کھٹکنے کے باوجود گھر سے نہیں نکلی، فقط باپ کی آواز پر دروازہ کھولتی تھی۔ دو دفعہ سلیمان بھی آیا لیکن اس نے اس کی آواز پہچان کر دروازہ نہیں کھولا۔ کلاس فور کے دو ملازمین، گینگ مین اور گیٹ مین تو قریباً دروازہ توڑنے لگے تھے۔ اس نے باہر سے آنے والی آوازیں سنی تھی۔ محلے والوں نے لوگوں کے ایسے جوش کی وجہ سے انہیں گالیاں سنا کر بھگا دیا تھا۔ بدلے میں وہ دونوں انہیں بشمول شبانہ گالیاں سناتے رہے تو ان کو مار بھی بہت پڑی۔ کسی سے کہا، "تمہاری ماں لگتی ہے کیا؟"

گھونسے مارنے والے ایک شخص کو کہا، "تمہاری بہن لگتی ہے کیا؟"

ایسا تماشا سن کر اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکان چھا گئی اور اسے من کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگا۔ اسے یہ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ لوگ اس کے لئے ایک دوسرے سے ایسی کاروائیاں کرتے ہیں۔

دوسری رات نشے میں ڈوبے رحیم داد کو گھر پہنچانے والے شخص نے واپس جانے سے انکار کرتے ہوئے فرمائش کر دی، "مجھے رحیم داد لے کر آیا ہے میں یہیں رکوں گا۔"

شبانہ نے اس کی شکل دیکھی، جھک کر چپل میں ہاتھ ڈالا تو اس شخص نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اس شخص کے بھاگنے کے انداز پر وہ بہت زیادہ ہنسی اور اس کے اندر کا سارا غبار ایسے ہلکا ہو گیا جیسے وہ دھواں بھرے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی ہو۔ اس رات چین سے سوئی۔ صبح سویرے اٹھ کر باپ کے لئے ناشتہ تیار کیا۔ رحیم داد بھی خوش ہوا کہ اسے بیٹی نے بڑے دنوں بعد

ناشتہ کروایا ہے۔

وہ نہا دھو کر دھوپ میں لٹکے ہوئے کپڑے اتار کر برآمدے میں آئی۔ کپڑوں کو تہہ کر رہی تھی کہ رحیم داد گھر آیا، مہینوں بعد ہی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ رحیم داد دوپہر میں گھر آئے لیکن اگر آتا بھی تھا تو شبانہ موجود نہیں ہوتی تھی۔

وہ رحیم داد کے خوشامدی انداز سے ہی سمجھ گئی کہ وہ اسے کسی مہمان کے آنے کا کہے گا۔ رحیم داد اس کی برابر میں بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پانچ سو روپے تھے۔ "سلیمان آیا تھا۔" رحیم داد نے پیسے دکھا کر کہا۔ "یہ پیسے اسی نے دیئے ہیں۔"

شبانہ سمجھ گئی۔ انجان ہو کر باپ سے پوچھا، "کس لئے؟"

"تمہیں سب پتا ہے، وہ تمہارے پاس آیا تھا۔ اس نے تمہیں سب کچھ بتایا ہوگا۔" رحیم داد نے نرم لہجے سے کہا۔

شبانہ نے رحیم داد کے اندر دبکی ہوئی آنکھوں میں دیکھا، جہاں اسے لالچ کے کھدے ہوئے کنویں دکھائی دیئے، "کیا کرنا چاہیے؟" اس نے غصے بھرے لہجے میں رحیم داد سے پوچھا۔

"ایسا موقع پھر نہیں آئے گا۔ تمہیں اسٹیشن ماسٹر کے گھر رہنا ہوگا۔ ایک ہزار تمہیں اور پانچ سو مجھے ملیں گے، ہر ماہ!" رحیم داد نے للچائے ہوئے انداز سے کہا، "اور ہاں، وہ گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ کام کاج بھی کم کرنا پڑے گا اور زمانے کی بہت سی پریشانیوں سے بھی دور رہو گی۔" رحیم داد نے اسے قائل کرنے کے لئے اپنی طرف سے دلائل دیتے ہوئے کہا۔

شبانہ تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئی۔ "ابا میں وہاں رکوں گی نہیں، واپس گھر آجایا کروں گی۔" اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اندھا کیا چاہے ایک آنکھ۔ لیکن رحیم داد کو جیسے دونوں آنکھیں مل رہی تھیں۔ دل میں بہت خوش ہوا۔ اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا، "تم یہ بات اس سے نہیں کرنا۔ دن کو تو ویسے بھی وہ

ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔ تم چاہو تو صبح کو گھر آنا۔ پھر شام کو وہاں۔"

شبانہ نے باپ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے تہہ کیے ہوئے کپڑے بانہوں میں سمیٹے، جیسے گذرے ہوئے وقت کو سمیٹ رہی ہو۔ صندوق کھول کر کپڑے اس میں رکھے۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے کمرے میں آیا۔ اسے شک ہونے لگا کہ شاید شبانہ نہ جائے۔ اس لئے وہ اسے دوبارہ قائل کرنے کے لئے مختلف باتیں کرتا رہا، لیکن شبانہ کمرے کا ساماں سمیٹنے لگی۔ جواب نہ ملنے پر رحیم داد خفا ہونے لگا لیکن وہ احتیاط بھی کر رہا تھا، اُسے یہ ڈر تھا کہ کہیں شبانہ سرے سے انکار ہی نہ کردے۔

شبانہ باپ کی بیچینی اور پریشانی کو سمجھ رہی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اب وہ بالکل خفا ہو جائے گا تو اس کے سامنے آکر کہا، "ابا اسی لئے ہی تو سامان سمیٹ رہی ہوں۔"

رحیم داد نے بے اختیار اپنی بیٹی کی پیشانی کو چوما۔ شبانہ نے بہت عرصے بعد باپ کے پیار کو محسوس کیا، لیکن اس مطلبی پیار پہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی تھی۔

شبانہ کو ماں اور باپ کی ایک دوسرے سے اتنی مختلف شخصیتوں پر حیرانی ہوتی تھی، اسے ماں یاد آتی رہتی تھی۔ اس کے کردار کی تعریف اس کے مرنے کے بعد بھی تھی۔ لیکن اس کا باپ اگر کسی کو پسند تھا تو صرف ان چند لوگوں کو جو اس کے پیسوں سے نشہ کرتے تھے۔ کبھی رحیم داد ان کے پیسوں سے بھی شراب پی لیتا تھا تو اس کے دوست اس کا گلا کرتے تھے۔ شکایت لے کر شبانہ کے پاس بھی آجاتے تھے کہ اپنے باپ کو سنبھالو یا اسے پیسے دو۔

رحیم داد سلیمان سے ملے ہوئے نوٹوں کو دیکھتے خوشی سے گنگناتے ہوئے باہر چلا گیا۔ دروازے پر پہنچ کر اچانک کچھ یاد آیا، واپس شبانہ کے پاس آیا اور اسے دو سو روپے دیکر پھر باہر چلا گیا۔ شبانہ جانتی تھی کہ اس کا باپ باقی ہر بات بھول سکتا ہے، لیکن شراب کے لئے پیسے کبھی نہیں بھولتا۔ جب پیسے کم پڑ جائینگے تو اسے یہ دو سو روپے ضرور یاد آئینگے اور پھر زمین آسمان ایک

ہو جائے لیکن شبانہ کو دیئے ہوئے پیسے واپس ضرور لے گا، چاہے ہفتے کے بعد یا پھر مہینوں بعد۔

☆☆☆

سعید احمد کو ملا ہوا گھر تقریباً بنگلہ نما تھا۔ انتظار گاہ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ تین کمرے، ڈرائنگ روم، لاؤنج، کچن، دو اطراف میں لان بھی تھا۔ انگریزوں کے دور کی تعمیر کا کچھ حصہ ویسے ہی تھا اور کچھ حصے میں تبدیلی کی گئی تھی۔ گھر میں مغرب کے بعد جلد ہی روشنی کم ہونا شروع ہو گئی۔

سعید آفس ٹائم سے دو گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ ایک گھنٹہ نیند کی، جاگا تو نہا کر اس نے سفید رنگ کے کپڑے پہنے۔ کپڑوں پر رائل میرج پرفیوم لگا کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھا۔ چائے پی، وہ انتظار میں تھا۔ بار بار اس کی نظریں سامنے لگی ہوئی گھڑی کی طرف جا رہی تھیں۔ ہر سیکنڈ کی ٹک ٹک پر اس نے ہندسے گننا شروع کیے۔ شام کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ ماحول میں رات کے آنے کے طبل بج چکے تھے۔

گھر کی بیل بجی۔ سعید احمد کے بدن اور رگوں میں لہر سی دوڑ گئی جیسے اس نے پانی ملائے بغیر بلیک لیبل سے گھونٹ بھرا ہو۔ اس کے نوکر نے آکر بتایا کہ سلیمان آیا ہے اور کام والی عورت کو بھی ساتھ لایا ہے۔

" یہ اچھا ہوا، کبھی میس، کبھی کینٹین تو کبھی ہوٹل سے کھانا کھا کھا کر تنگ ہو گیا تھا اور گھر کی صفائی بھی۔۔۔ "نوکر سے یہ بات کرتے ہوئے صاف لگ رہا تھا کہ اس کے دل میں ایک بات ہے اور زباں پر دوسری۔ نوکر کے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ، جو اس نے بہت چھپانے کی کوشش بھی کی تھی، دیکھ کر سعید احمد نے چہرہ دوسری طرف کر کے اسے کہا، "جاؤ لے کر آؤ۔"

لوکو شیڈ کی شبو کو وہاں کا کون سا ایسا آدمی تھا جو نہیں جانتا تھا اور اس کے بارے میں نہ سنا ہو۔ سعید احمد کا نوکر معاملے کو تو سمجھ گیا تھا، وہ شبانہ اور سلیمان کو اندر لے آیا۔ اس دن کے بعد سلیمان بھی ایسا بدنام ہوا کہ بات اس کے باپ رحمت تک بھی پہنچی۔

سلیمان کچھ دیر کے بعد وہاں سے واپس چلا گیا۔ شبانہ اتنا بڑا گھر دیکھ کر، سعید کی موجودگی میں بھی خود کو تنہا سمجھنے لگی۔ ڈرائنگ روم ہی اتنا بڑا تھا کہ کلاس فور کے ملازمین کو ملے ہوئے ایک ایک کمرے والے تین کوارٹر بن جائیں۔

سعید احمد نوکر کے سامنے اسے سمجھاتے ہوئے کہنے لگا، سارے گھر کی صفائی بھی تم کرو گی، کپڑے بھی دھونے ہونگے اور کھانا بھی پکاؤ گی۔"

اس نے نوکر سے کہہ کر شبانہ کو کچن بھی دکھایا، جو بھی لگ بھگ اس کے کمرے جتنا تھا۔ شبانہ نے ماں سے جو چیز اچھی بنانا سیکھی تھی، وہ تھا آلو پلاؤ۔ اس نے سعید احمد سے کہا، "صاحب آج پلاؤ بناؤں؟"

شبانہ سعید کے لہجے اور آنکھوں سے سمجھ گئی کہ وہ کتنا بھوکا ہے۔

"ہاں جو چاہو بنالو، لیکن جلدی۔" سعید احمد نے اسے کہا۔ اس نے پہلی بار شبانہ کا جائزہ بھی لیا۔ لمبے کالے بال تھے۔ جنہیں کنگھی کر کے کلپ لگا کر آئی تھی، گلے میں سفید رنگ کا دوپٹہ تھا۔ صاف رنگت، بڑی اور چمکدار آنکھیں۔ بڑی پلکیں۔ گالوں پر ہلکی لالی، آنکھوں کو بھا جانے والا چہرہ، بھرا ہوا بدن، مکمل طور پر عورت کا احساس، ہونٹوں پر مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ پاؤں میں سادہ چپل پہنی ہوئی تھی، لان کا سفید اور پیلے رنگ کی پرنٹ ولا جوڑا پہنا ہوا تھا۔

شبانہ سمجھ گئی کہ وہ اسے آنکھوں سے پی رہا ہے۔ اس لئے کچھ دیر تک وہاں خاموش کھڑی رہی، جب دیکھا کہ سعید احمد کی نظریں اس کے چہرے سے لیکر پاؤں تک سفر کر کے پہنچی ہیں تو نخریلے انداز سے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا، "صاحب، اب میں کچن میں جا رہی ہوں۔"

وہ کچن میں چلی گئی، سعید احمد کے دل میں آیا کہ وہ اس کے پیچھے کچن کی طرف چلا جائے، لیکن اس نے خود کو روک لیا اور لاؤنج میں چلا گیا، جہاں ٹی وی آن کر کے وقت بِتانے لگا۔ وہ لاؤنج میں ایسے مسافر کی طرح بیٹھا جس کی ٹرین چھ گھنٹے دیر سے آنے تھی۔

پلاؤ تیار ہو گیا تو شبانہ ڈرائنگ روم میں گئی، جہاں سعید احمد موجود نہیں تھا، "صاحب، او صاحب، کہاں ہیں!" اس نے زور سے پکارتے ہوئے کہا۔ سعید نے لاؤنج میں آواز سنی تو ڈرائنگ روم کی طرف آ گیا۔ سعید کو دیکھ کر ایک دم سے کہا، "صاحب پلاؤ تیار ہے۔ گرما گرم کھائینگے یا۔۔۔"

"میں کھانا دیر سے کھاتا ہوں۔ تمہیں تو بھوک نہیں لگی ہے؟" سعید نے اس سے پوچھا۔ نوکر جا چکا تھا، اس لئے خود کو ذہنی طور پر پر سکون محسوس کرنے لگا۔

شبانہ نے کہا، "نہیں صاحب مجھے بھی فی الحال بھوک نہیں ہے۔"

سعید لاؤنج میں واپس آیا، لیکن شبانہ ڈرائنگ روم میں کھڑی رہی۔ سعید نے محسوس کیا تو وہ دروازے تک آیا، وہیں سے اسے آواز دی۔ شبانہ لاؤنج میں آئی۔ وہاں ٹرالی کے اوپر ٹی وی رکھا تھا۔ صوفہ سیٹ کے علاوہ ایک کونے میں فرج رکھا تھا۔ کارنر ٹیبلس پر گلدستے رکھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سعید احمد کی جوانی کی تصاویر لگی ہوئی تھیں اور کچھ پینٹنگس بھی لگی ہوئی تھیں۔

سعید نے فرج سے شراب کی بوتل نکال کر ٹیبل پر رکھی۔ پانی، برف اور خشک میوہ نکالا۔ دو گلاس رکھے۔

شبانہ جب آئی تھی تو گھر میں اس نے تنہائی محسوس کی تھی، لیکن لاؤنج میں آکر اسے اب کوئی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس بات پر اُسے حیرانی بھی ہوئی۔ سعید احمد نے گلاس اس کے آگے رکھتے ہوئے اسے اشارے سے پینے کے لئے کہا تو اس نے بھی بے اختیار

اشارے سے گردن ہلا کر ہاں کر دی۔

☆☆☆

دن کے گیارہ بجے ہونگے کہ وہ مکمل طور پر جاگ چکی تھی۔ اسے اپنا سر بہت بھاری محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کے سر پر اس کے اٹھانے کی صلاحیت سے کہیں زیادہ بوجھ ڈالا گیا ہے۔ سر کو جھٹکا دیا تو شدید درد محسوس ہونے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کو دبانے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کے سر سے بوجھ تھوڑا تھوڑا کم ہونے لگا۔ آدھے گھنٹے تک اسے اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ کمرے کو دیکھنے لگی۔

وہ کمرہ سعید احمد کا بیڈروم تھا، جس کے مغرب والی دیوار کے ساتھ ایک بڑا بیڈ رکھا تھا۔ دو بڑی کرسیاں اور ان کے درمیاں ایک چھوٹا ٹیبل تھا۔ کپڑوں کی الماری کے علاوہ کارنر ٹیبلیں بھی رکھی تھیں تو ڈریسنگ ٹیبل بھی تھا۔ جبکہ الماری کے ساتھ دیوار پر پینٹنگس لگی ہوئی تھیں اور دروازے پر بھاری پردہ لگا ہوا تھا۔ دروازے کے اوپر گھڑیال لٹکا ہوا تھا، جس کی ٹک ٹک اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ سارا فرنیچر لکڑی کا تھا۔ چیزوں کی صفائی کم تھی۔

سعید احمد کو رات میں پہنے ہوئے کپڑے کرسیوں پر رکھے تھے۔ شبانہ نے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد خود کو دیکھا تو وہ فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بیٹھی تھی۔ جہاں ایک تکیہ بھی رکھا تھا۔ جیسے جیسے اس کے سر کا بھاری پن کم ہوتا گیا، اسے یاد آنے لگا کہ اس نے اپنی مرضی سے شراب پی تھی اور سعید نے اس کے ساتھ سہیل کی طرح دھوکا نہیں کیا تھا۔ اسے دوسری بات یاد آئی کہ زیادہ پینے کے بعد سعید ایک جنونی شخص بن گیا تھا۔ اس نے اپنی بازوؤں کو دیکھا، اس کی گورے بازوؤں پر سرخ نشاں پڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ دائیں کان کے نیچے اسی طرح کی چوٹ کا نشان تھا۔ آنکھ کے نیچے بھی اس کے چہرے کی جلد پر جلن

محسوس ہو رہی تھی۔ یہ شاید رات کے کسی درمیاں والے حصہ میں ہوا تھا۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی، اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے اسے ہاتھ جوڑ کر مارنے سے روکا بھی تھا، جس وقت وہ ہاتھ جوڑ کر اسے روک رہی تھی اس وقت سعید کو اس پر اتنا ترس آیا کہ وہ خود بھی نیچے بیٹھ گیا تھا اور شبانہ کو اوپر بیڈ پر بٹھا کر اس سے معافی مانگتا رہا تو پیار بھی کرتا رہا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ اسے لاؤنج مانوس سا لگا۔ لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھی۔ ٹیبل پر جگ اور گلاس رکھا تھا۔ اس نے پانی پیا۔ اسے یاد آیا کہ دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیکر کمرے تک پہنچے تھے۔ کمرے کی آخری دو باتیں اسے اب بھی یاد تھیں۔ "دیکھو، مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہوں، مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میری اس بری عادت کی وجہ سے کوئی بھی عورت میرے ساتھ رہ نہیں پاتی۔" سعید نے اس کی منتیں کرتے ہوئے کہا تھا۔

غور کرنے پر اسے یاد آیا کہ سوتے وقت سعید احمد نے اسے یہ بھی کہا تھا، "میں بستر پر اکیلا ہی سوتا ہوں۔ کوئی ساتھ سوئے تو نیند نہیں آتی۔"

جس کے بعد وہ نیچے قالین پر سوئی تھی، سعید نے اس کی طرف ایک تکیہ بھی پھینکا تھا۔ شبانہ کو اتنا بھی یاد تھا کہ وہ شاید صبح کا وقت ہو گا جب سعید نے اسے جگانے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ ایسی گہری نیند میں تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے جاگی بھی تھی تو سعید کی زچ ہوئی آواز میں اتنا سنا، "جاگ جاؤ تو گھر کی صفائی کر دینا۔"

اس کے سر کا درد اور بوجھ کم تو ہوا تھا، لیکن پوری طرح نہیں۔ وہ اٹھ کر کچن میں گئی۔ اپنے لئے چائے بنائی، جس کے بعد اس نے اپنے جسم اور ذہن میں چستی محسوس کی۔ شبانہ نے گھر کی صفائی دل سے کی۔ گھر سے کچرا تو کم نکلا لیکن سامان سے دھول بہت زیادہ نکلی۔ کام کرتے ہوئے اس نے چوٹوں والی جگہ درد بھی محسوس کیا۔ اس دوران اسے ایک دفعہ بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ

لو کو شیڈ میں اپنے کوارٹر کی طرف جائے۔

تین چار گھنٹے تک اس نے سارے کمروں، ڈرائنگ روم اور لائونج کی صفائی کی۔ بھوک کا احساس ہوا تو سوچا کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کھاتی ہوں۔ ڈرائنگ روم میں قالین پر سیدھی ہو کر لیٹی تو اسے نیند آگئی۔ تب تک نہیں جاگی جب تک سعید شام کو گھر پہنچا، جس نے اسے کندھوں سے جنجھوڑ کر جگایا۔

وہ اٹھ کر بیٹھی۔ شام ہو چکی تھی، ٹیوب لائیٹیں جل رہی تھیں۔ سعید نے ٹیبل پر رکھے ہوئے شاپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے کہا، "مجھے پتا تھا کہ تم دوپہر کو بھی سوئی ہو گی۔ تمہارے لئے برگر لایا ہوں۔ اٹھو ہاتھ منہ دھو کر کھالو۔"

شبانہ نے سعید کی طرف پیار سے دیکھا، آفس ڈریس میں بیٹھا ہوا سعید اسے تشدد کرنے والا پولیس والا لگا۔ لیکن اس کے لہجے میں اپنائیت بھی تھی۔ شبانہ بغیر کوئی جواب دیئے اور بات کیے برگر کھانے لگی۔ ہاتھ منہ دھونے والی بات اس کے لئے خاص اہمیت کی حامل نہ تھی۔ سعید یونیفارم تبدیل کرنے کے لئے کمرے میں چلا گیا۔

شبانہ اس کا تشدد برداشت کرنے لگی۔ سعید روزانہ شراب پینے والا تھا اس لئے وہ بھی اس کی طرح پینے لگی۔ گھر میں تنہا رہنا اس کے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا لیکن کسی اجنبی کے گھر میں تنہا رہنا اس کے لئے نئی بات تھی۔ اس نے اس نوکر کو بھی گھر کے اندر بمشکل ہی دیکھا تھا۔ سعید نے اسے گھر کے باہر تک محدود کر دیا تھا۔

شبانہ کھانا بھی پکاتی تھی تو صفائی بھی کرتی تھی۔ اسے حیرت انگیز خوشی ہوئی کہ سعید اس کے لئے سلے سلائے کپڑے بھی لے آیا اور وہ اسے ایسے فٹ تھے کہ اسے داد دینی پڑی کہ اس نے اپنی نظروں سے اس کی ناپ کیسے یاد رکھی اور ریڈی میڈ کپڑے خرید کر لایا۔

سعید پر جنونی کیفیت دو گلاس پینے کے بعد تیسرے گلاس سے طاری ہوتی تھی، چوتھے

اور پانچویں گلاس کے وقت وہ رونا بھی شروع کر دیتا تھا۔ شبانہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا اس لئے رات کو سعید کے تشدد سے بچنے کے لئے اس نے بھی ایک ٹرک سمجھ لی تھی۔ جس وقت سعید پر جنونی کیفیت سوار ہوتی تھی۔ میوزک چلا دیتی تھی کیونکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ موسیقی کا بہت زیادہ شوقین ہے۔ جیسے ہی موسیقی بجنے لگتی، وہ سعید کو اٹھا کر اس کے ساتھ ڈانس کرنے لگتی تھی۔

دوسرے ہفتے کی دوسری رات شبانہ نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے گھائل ہے۔ اس رات کے بعد وہ اس سے یہ بات سنتی رہی، "شبو، بھٹکا ہوا میں بھی ہوں اور بھٹکی ہوئی تم بھی ہو۔ اس میں اپنا کوئی قصور نہیں ہے۔۔۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کوئی قصور نہیں ہے۔" شبانہ سمجھ رہی تھی کے وہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلی دے رہا ہے، "مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی یہ راستہ اپنی مرضی سے نہیں چنا ہو گا۔ میں بھی نہیں چاہتا، لیکن کیا کروں۔" اس نے اپنے سینے پر زور زور سے تھپڑوں کی طرح ہاتھ مارتے ہوئے کہا، "یہ جسم بھی تو بھوکا جانور ہے۔"

شبانہ کے پاس ایسی باتوں کے جوابات کم تھے۔ وہ کم گو تھی، لیکن سنتی زیادہ تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ سعید احمد کی کچھ باتیں اس کے دل کی ہیں۔ ایسی باتوں سے اس کے ہونٹوں پر دکھی مسکاں چھا جاتی تھی۔

دو ہفتوں کے بعد ایک رات تیسرا پیگ چڑھاتے ہوئے اچانک سعید احمد کو کیا سوجھا، "میں تم سے کہتا ہوں تم اب ہفتہ بھر نہ آنا۔"

شبانہ اس وقت اپنے لئے تیسرا پیگ بنا رہی تھی اور اسے بات سمجھ میں نہ آئی کہ اچانک اس نے ایسی بات کیوں کی، "چھٹی پر جا رہے ہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" سعید احمد نے مختصر جواب دیا اور چھت کی طرف گھورنے لگا۔

"تو پھر؟"

"تم ایک ہفتہ چھٹی کر سکتی ہو!" سعید نے جواب دیا۔

شبانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "تھک گئے ہیں یا عمر کا تقاضہ ہے۔" شبانہ نے شرارتی انداز سے کہا۔

"میں نے تمہیں اپنے پاس جسم کے حصے کی طرح محسوس نہیں کیا۔ کیوں کہ جسم ان جانوروں کی طرح ہیں جو اپنی اپنی خوارک کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن تنہائیوں کو بھرنا اور کسی کے روح کے قریب رہنا ہی اصل بات ہے۔" سعید کی آواز میں ایسا تاثر تھا، جس نے شبانہ کو بالکل خاموش کر دیا۔

دونوں کے درمیاں کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس دوران ان کے گلاس ہونٹوں سے باتیں کرتے رہے۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ پیگ ختم نہ ہو۔" سعید نے اس کے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں اس شکوہ کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا اس لئے جیسے ہی یہ ختم کرو تم یہاں سے اسی وقت چلی جاؤ۔"

"اس وقت!۔۔۔ کیوں؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"جب روح کی رموز کو سمجھنے لگو گی تو تمہیں سمجھ میں آجائیگا کہ وصل اور بچھڑنا کیا ہوتا ہے۔" سعید نے کیف والی کیفیت میں کہا۔

"پھر کب آؤں؟" شبانہ نے گلاس کے چوتھائی حصہ میں بچی ہوئی شراب ایک ہی سانس میں پی کر اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جب میں تمہیں پکاروں گا تو میری آواز تم تک خود بخود پہنچ جائے گی اور تم چلی آؤ گی۔" سعید نے جواب دیا۔

شبانہ تھوڑا آگے جا کر رک گئی اور اسے کہا، "اگر میں پکارنا چاہوں تو پھر؟"

"تو پھر۔۔۔" اس سے آگے سعید کچھ کہہ نہ سکا۔ شبانہ اس کے ہاں سے تیزی سے چلی گئی۔ وہ دروازے کو دیکھتا رہا۔ اسے ایکدم سے گھر خالی خالی محسوس ہونے لگا۔ ویرانے کا احساس

اس کے لئے نیا تو نہ تھا، لیکن شبانہ کے جانے کے بعد اسے لگا کہ وہ ایسے اسٹیشن پر کھڑا ہے، جہاں نہ کوئی ٹرین آئے گی اور نہ کوئی مسافر۔ بس دونوں اطراف میں ریلوے کی پٹریاں ہی پٹریاں ہیں۔

☆☆☆

شبانہ نے کوارٹر کی صفائی کی۔ جتنے دن وہ سعید کے پاس تھی اس کے باپ نے گھر کو میخانہ بنا رکھا تھا۔ اسے رحیم داد پر غصہ آرہا تھا۔ واپس آکر اسے یہ بھی پتا چلا کہ ساتھ والے کوارٹر کرائے پر دے دیئے گئے ہیں۔ اسے لگا جیسے وہ مہینوں باہر رہ کر آئی ہو۔ رات کو باپ سے ملاقات ہوئی۔ جس کے لئے اس کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ شبانہ نے زیادہ شور مچانے کی بجائے اسے روک دیا کہ آئندہ اس کے موالی دوست گند پھیلانے یہاں نہ آئیں۔ رحیم داد گند لفظ پر غصہ ہونے لگا لیکن شبانہ نے اسے مزید کوئی جواب نہیں دیا۔

شام کو پرچون کی دکان سے سودا سلف لانے گھر سے نکلی تو سامنے جینز اور گہری لال شرٹ میں ملبوس ایک نوجوان کو آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ بھی تھا۔ اسے وہ شخص اجنبی لگا۔ شبانہ نے دیکھا کہ جب وہ اس سے تھوڑا دور تھا تو اسے ہی دیکھتا آرہا تھا لیکن جب اس کے نزدیک آیا تو اس کے پاس سے ایسے گذر گیا جیسے اس نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ شبانہ نے مڑ کر دیکھا تو وہ ساتھ والے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔

"وہ دبے ہونٹ بڑبڑائی، "اچھا تو یہ کرایہ دار ہے۔"

وہ سوچتی آگے چلی گئی۔ اسے سہیل نے چونکا دیا جو ایک پیڑ کے پیچھے سے اچانک نکل کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ شبانہ کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اسے یہ بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہے یا یہ اس کا کوئی وہم ہے۔

"دیکھ شبو، تم سارے جہاں سے خوش ہو۔ تو پھر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ مجھ سے تمہاری ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔" سہیل نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ اس کے لہجے میں منت اور بیقراری تھی۔

جب شبانہ کو یقین ہو گیا کہ وہ سہیل ہی ہے۔ تو اس نے کہا "تم کمینے انسان ہو، میں آج جو زندگی بسر کر رہی ہوں، اپنے آپ کو مار کر، جس انداز سے جی رہی ہوں، اس کے بڑی حد تک قصوروار تم بھی ہو۔ میرے لئے تم کتوں سے بھی بدتر ہو، سمجھے۔" شبانہ نے چیختے ہوئے اسے کہا۔" تم سے اللہ پوچھے گا۔"

بہت وقت بیت گیا تھا اس لئے سہیل سمجھ رہا تھا کہ شاید شبانہ کے لئے اب پرانی باتیں کوئی معنی نہیں رکھتیں لیکن اس کا ایسا جارحانہ رویہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ اس وقت اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔

یہ تو ابھی تک کسی کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ گلزار کی موت کیسے واقع ہوئی؟ یہ سوال تو بعد میں آتا ہے لیکن لوگوں کو تو یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ گلزار نام کا کوئی شخص تھا۔ یاد تو کسی کو یہ بات بھی نہیں تھی کہ شبانہ کی بھی کبھی کوئی شادی ہوئی تھی اور وہ بیوہ عورت ہے۔ شبانہ بھی شاید گلزار کو بھول چکی تھی۔

اسے یہ خیال کم ہی آتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو کیا بنا دیا ہے۔ لیکن اگر ایسا خیال آ بھی جاتا تھا تو شدید پریشان ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے ہوئے وقت کو یاد کرنے سے اکثر کتراتی تھی۔ لیکن آنے والے دنوں کی کہانی اسے ایک جیسی لگتی تھی۔ یہ سوچ کر پریشانی اسے گھیر لیتی تھی۔

کیا زندگی ایسے ہی کٹنی ہے؟ میری زندگی کا رنگ ایسے ہی سیاہ رہنا ہے یا میری زندگی ہے ہی ایسی؟

سعید کی ایک ہفتہ دور رہنے والی بات اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک شام وہ ٹہلتے

ٹہلتے اس کے گھر پہنچ گئی تو اس نے اسے کھلے دل کیساتھ خوش آمدید کہا۔ دوبارہ اس کے پاس پہنچ کر اس نے سعید کے بارے میں اندازہ لگایا کہ وہ دور رہ کر پھر ملنے کا قائل ہے۔ ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ میں زیادہ سکون محسوس کرتا ہے۔

اس کے پاس پہنچ کر شبانہ نے پہلا مطالبہ پینے کا کیا۔ اس نے یہ مطالبہ اس لئے کیا کہ سعید کو کسی کام کے سلسلے میں آفس جانا پڑا اور دیر سے آنے کا کہا۔ اسے خود پر حیرانگی ہوئی کہ اسے یہ طلب کیوں ہوئی۔

شبانہ سعید کے پاس رہ کر پینے کی عادی ہو گئی تھی۔ وہ سگریٹ بھی پیتا تھا۔ شبانہ نے بھی اسکے ساتھ مل کر کش لگانے شروع کیے تھے اور وہ بھی چرس سے بھرے ہوئے سگریٹوں کے۔ پہلے کش لگانے سے تو اس کی یہ حالت ہوئی کہ کھانستے کھانستے اس کی پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ زندگی میں ملے ہوئے دکھوں اور صدموں کی طرح سگریٹ کے کش کو بھی حصہ بنا دیا۔ یہ عادتیں اس کے لئے گھر کا ایسا فرد بن گئیں جیسے اس کا باپ۔

سعید کے پاس شبانہ کا ایک ماہ بھی نہیں گذرا تھا کہ رحیم داد وہاں آکر پہنچا۔ نہ فقط سعید سے اس نے اپنے پانچ سو روپے لئے بلکہ شبانہ کے پیسوں سے بھی پانچ سو روپے لے کر گیا۔ شبانہ کا یہاں آنے کا فائدہ سلیمان نے بھی لیا جسے سعید احمد نے پکی نوکری دلوائی تھی۔

سعید اسے ایک ہفتہ اپنے پاس رکھ کر پھر کچھ دن کی چھٹی دیتا تھا۔ اس طرح اس کے لئے پریشانی پیدا ہو رہی تھی۔

سعید احمد بھی اسے اچھا لگتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر اس کا جسم بھی ان اذیتوں کا عادی ہو گیا تھا جو سعید اسے دیتا تھا۔ کبھی اذیتوں سے بچتی تھی تو کبھی وہ اسے اچھی لگتی تھیں۔ وہ سعید کی باتوں اور خاموشی کی بھی عادی ہو گئی تھی۔ سعید کی باتوں میں اکثر ایسے واقعات ہوتے تھے جو اس سے مختلف اسٹیشنوں پر پیش آئے تھے۔ لیکن جو بات شبانہ کو اچھی لگتی تھی، وہ سن کر حیران ہو جاتی

تھی کہ ایک ہستی میں اتنی مختلف ہستیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔ "ہمارا وجود ہمارے بس میں آجائے تو اسے روح بنادیں۔" وہ شبانہ سے یہ بات شراب پیتے ہوئے نہیں، بلکہ صاف پانی سے گھونٹ بھر کر کہتا تھا۔ "روح چشموں کے پانی سے بھی صاف اور اجلی ہے۔ لیکن ہم اس پانی کو کبھی کبھی اتنا ابال دیتے ہیں کہ وہ اندر سے ہمارے وجود کو جلانے لگتا ہے۔"

اس نے ایک دفعہ بے خودی کے عالم میں سعید احمد سے کہا، "صاحب، روح روح تو بہت کرتے ہو، کبھی دیکھی بھی ہے؟"

سعید نے اس کی آنکھوں میں ایسی نگاہ ڈالی کہ وہ ایک لمحے کے لئے تو ڈر گئی۔ "میں تمہاری آنکھوں سے روح تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی تک اس کوشش میں بدن حائل ہو جاتا ہے۔ جب بدن حائل ہونا بند ہو جائے گا، روح بھی دیکھ لینگے۔ لیکن افسوس۔۔۔۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

شبانہ بہت ہنسی تھی، پیٹ پکڑ کر ہنسی میں دُہری ہوتے ہوئے کہنے لگی، "صاحب بڑھاپے میں ویسے بھی بدن حائل نہیں ہوتا، جس نے جوانی میں روح نہیں دیکھی، اس نے بڑھاپے میں دیکھ بھی لی تو کیا۔"

سعید احمد نہ فقط حیران ہوا، لیکن اسے یہ خیال بھی ہونے لگا کہ شبانہ روح کی رمز کو شاید سمجھتی اور پرکھتی ہے۔ اس دن کے بعد سعید احمد نے اسے تین ہفتوں تک خود سے دور رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اور اسے پانچ سو روپے دیکر چلے جانے کو کہا۔

لیکن پینا شبانہ کی ایسی عادت بن گئی تھی کہ گھر میں دو دن اسے پینے کے لئے کچھ نہیں ملا تو سلیمان کے پاس چلی گئی اور اسے ہر حال میں بندوبست کرنے کا کہا۔ سلیمان نے پہلے دن اسے آدھی بوتل اور سگریٹ لاکر دیئے۔

گھر میں اکیلے بیٹھ کر اس نے دو تین گھنٹوں میں آدھی بوتل پی لی اور گیارہ سگریٹ

پھونک ڈالے۔ اس رات اسے صرف یہ خیال آتے رہے کہ کوئی تو ایسا ہو جو اسے روکے اور کہے کہ غلط راستے پر چل رہی ہو۔ وہ پچھتاوے کی برسات میں بھیگتی رہی۔ اپنے آپ کو نصیحت کرنے کی کوشش کی تو خود پر غصہ آنے لگا۔ صاف اور ستھرے خیالات والی ماں کی یاد میں اسے نیند آگئی۔

اس نے خواب دیکھے تھے یا نہیں۔ اس کی نیند اس کے لئے ماں بن گئی۔ صبح کو وہ جاگنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ جاگ گئی۔ اس نے گہری اور لمبی نیند کی تھی۔

☆☆☆

اس کا نیا پڑوسی کوئی تیس برس کا ہوگا، جس کی قربت اس کے لئے بالکل نئے ذائقے کی طرح تھی۔ نئی باتیں، نیا انداز۔ بلال نام تھا اس کا۔ گندمی رنگت کا چہرہ، مضبوط جسم والا تھا۔ وہ زیادہ تر سنجیدہ رہتا تھا۔ شبانہ کی اس سے پہلی ملاقات تو راستے میں ہوئی تھی، جب اس نے اسے کوارٹر میں جاتے دیکھا تھا اور اسے لگا تھا کہ بلال اسے نظر انداز کر کے گذر گیا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری ملاقات ان دنوں ہوئی جب سعید احمد نے اسے آخری مرتبہ تین ہفتوں کے لئے خود سے دور کر دیا تھا۔ اس کے لئے جیسے امید کا دوسرا دروازہ کھل گیا تھا۔ یہ احساس اسے تب ہوا جب وہ اس نوجوان کے قریب ہو گئی تھی۔

دونوں کی ملاقات اس وقت ہوئی جب سرد موسم کی ایک شام میں بلال نے شبانہ کے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے انداز سے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہ کوئی نیا ہاتھ ہے۔ شبانہ نے جان بوجھ کر دیر کی۔ دروازہ دوبارہ کھٹکنے کے وقت شبانہ دروازے تک پہنچ چکی تھی۔

"کون؟" شبانہ نے نرم لہجے سے پوچھا۔

"میں بلال ہوں۔" باہر سے صاف اور واضح آواز آئی۔

شبانہ کی چھٹی حس نے اندازہ لگایا کہ یہ پڑوسی ہی ہے۔ اس کے انداز اور لہجے سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ حیدرآباد والی سائیڈ سے ہے۔ کلاس فور کے کچھ ایسے ملازمین اس کے پاس آتے رہے تھے جو حیدرآباد یا بدین سے تھے، جن کی گفتگو کا انداز اسے اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ان سے اسی انداز سے بات کر کے بہت خوش ہوتی تھی۔

دروازہ کھولا، سامنے بلال کھڑا تھا۔ اس نے ٹراؤزر پہنا تھا، جس کے اوپر جیکٹ تھا، سیدھے اور کالے بال تھے آنکھیں عورتوں کی آنکھوں سے بھی بڑی تھیں، لمبی ناک، کشادہ پیشانی، کلین شیو ہونے کہ باعث چمکیلے گال اور ہونٹوں کا رنگ گہرا بھورا تھا، "تکلیف کی معافی چاہتا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے شبانہ سے کہا۔

مسکراتے وقت اس کے سارے دانت اور مسوڑھے بھی نظر آرہے تھے۔ دانت تھوڑے بڑے اور مسوڑھے گہرے بھورے تھے۔ "مجھے ماچس کی ضرورت ہے، میں صرف ایک یا دو تیلیاں ہی جلاؤں گا، آپ کو جلدی واپس کرتا ہوں۔"

شبانہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی فقط گردن ہلا کر ہاں کی۔ واپس جا کر ماچس لے آئی اور بلال کو دی۔

بلال ماچس لیتے وقت مسکرانے کی بجائے سنجیدگی سے "شکریہ" بول کر چلا گیا۔ شبانہ واپس اپنے کمرے میں آئی، اسے ماچس کی واپسی کا انتظار تھا یا بلال کا، یہ وہ تب تک سمجھ نہ پائی جب تک بلال اسے ماچس واپس دے کر چلا گیا۔ بلال کے جانے کے بعد شبانہ ماچس کو دیکھتی رہی اور چار تیلیاں نکال کر انہیں جلاتی رہی۔ چاروں تیلیاں ختم ہونے کے بعد اس کے سامنے بلال کا چہرہ تھا اور وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو یاد کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں یاد آئیں کہ وہ کیا کر رہی تھیں۔ وہ مسکرا دی۔

آنکھوں سے تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ دیکھنے آیا تھا کہ کتنی خوبصورت ہوں۔ ہاں

بالکل ایسا ہی تھا۔ اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس نے یقیناً میرے متعلق معلومات لی ہو گیں، تبھی تو آیا تھا، نہیں تو اسے ماچس کی کیا ضرورت؟ آخر اس کے پاس ماچس کیوں نہیں ہو گی؟ اس کے ہونٹ چغلی کھا رہے تھے کہ وہ سگریٹ نوشی نہیں کرتا۔ لیکن میرے ذہن پر کیوں سوار ہو گیا ہے، کہیں وہ شراب کی بوتل کی طرح تو نہیں ہے۔

وہ اپنی سوچ پر مسکرا دی۔ حقیقت یہ تھی کہ بلال اور شبانہ اپنے اپنے کوارٹروں میں ایک دوسرے کے انتظار ہی میں تھے۔ بلال کے ساتھ رہنے والے اس کے دونوں دوست اپنے شہروں کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ شبانہ اور بلال نے چاہ کر بھی اس رات ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ جبکہ دونوں کے دل ملنے کے لئے بیتاب تھے۔

ایک لمحے شبانہ کو یہ خیال آیا کہ کیا عورت ہی ایک وقت میں مختلف مردوں کے خیالات ذہن میں رکھتی ہے یا مرد بھی۔ اس سے ملنے والے کئی مردوں نے ہمیشہ اسے ہی اپنا پہلا پیار، پہلی عورت یا بیوی کے علاوہ پہلی محبوبہ قرار دیا تھا۔ اسے ایسے خیالات آتے تھے تو کبھی کبھی اپنے آپ پر بھی غصہ آتا تھا اور مردوں سے نفرت بھی ابھرتی تھی۔ لیکن اس کا دل ایسا معصوم تھا کہ وہاں نفرت کو بہت زیادہ اجنبیت لگتی تھی۔ ایک دم سے وہاں نظر انداز کرنے کے خیالات آجاتے تھے یا معصوم احساسات کے پھول کھلتے تھے۔

دونوں کوارٹروں کی رات، نیند اور جاگ میں گذری۔ پچھلے پہر میں رحیم داد نے جب دروازہ کھٹکھٹایا تھا تو شبانہ نے بغیر چپل پہنے دوڑتے ہوئے دروازہ کھولا تھا اور باپ سے کچھ کہے بغیر واپس ہوئی تھی۔ اس وقت ساتھ والے کوارٹر کا دروازہ بھی کھلتے اور بند ہوتے سنا تھا۔

صبح کو شبانہ باہر نکل آئی۔ درختوں کی عمریں بھی بڑھ چکی تھیں، ان کا قد، ان کی شاخیں اور ان کے پتے زیادہ بڑھ گئے تھے، جب وہ سردی چاہے گرمی کے موسم میں ان ہی کی چھاؤں میں دوڑتی رہتی تھی۔ اسے ہر وقت یہ چھاؤں اچھی لگتی تھی، جہاں ٹہلتے ہوئے اس کی مایوسی بھی کچھ

لمحوں کے لئے ان پرچھائیوں میں گم ہو جاتی تھی۔

بلال کوارٹر کے دروازے سے نکلا، اس نے قمیض شلوار پہنی ہوئی تھی، وہ شبانہ کو اچھا لگنے والا مرد محسوس ہوا۔ اس نے شبانہ کو پیڑ کے پاس کھڑا دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے حیرت کا اظہار کیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ سیدھا اس کے پاس چلا جائے لیکن لوگوں کی آمد و رفت دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا، شبانہ کے قریب پہنچ کر اپنی چال کی طرح آہستہ آہستہ بول کر کہنے لگا، "اگر آپ کو برا نہ لگے تو شام آپ میرے ہاں آئیں یا میں آپ کے پاس آؤں۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

شبانہ نے اس کی طرف ایسی نظر سے دیکھا کہ اس کی جگہ پر اگر کوئی کمسن نوجوان ہوتا تو اسی وقت گر کر اس کے پاؤں میں پڑا ہوتا لیکن بلال اپنی مسکراہٹ سے اس قاتل نظر کے آگے ڈھال بنا کر چلا گیا۔ شبانہ کو ایسا انتظار دے گیا جیسے اس پر کوئی وار کر کے چلا گیا ہے۔ اسے جب یہ بات یاد آئی کہ رات کو تو اسے پینے کی طلب بھی نہیں ہوئی تھی، طلب تو کیا اس نے تو بات ہی بھلا دی تھی۔ تو وہ اپنے خیالوں میں مسکرا دی۔

اسے گھر میں بہت زیادہ سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو شال سے ڈھانپ لیا۔ سردی کم نہ ہوئی تو رضائی تان کر سو گئی اور اسے نیند آ گئی۔ نیند سے پہلے اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بلال کے پاس جائے گی۔ اسے یہ خیال اس لیے آیا کہ اسے فکر تھی کہ اس کا باپ رات میں کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔

☆☆☆

یہ کوارٹر کیبن مین قدرت اللہ کا تھا، جس نے بھی مجید کی طرح شبانہ کی مدد کرنے کے

عیوض "وصولی" کی تھی۔ شبانہ قدرت اللہ کے گھر اس وقت بھی جاتی تھی جب وہ ابھی بچی تھی اور اس کی جوان بیٹیوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ اس کی بیوی شبانہ کو بیٹی کہتی تھی، لیکن وہ قدرت اللہ کی وہی بیوی تھی جس نے قدرت اللہ سے اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ اس نے شبانہ کی مدد کیوں کی تھی۔ اس ناراضگی کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں قدرت اللہ نے اسے بچوں سمیت میکے بھیج دیا تھا اور جب واپس آئی تھی تو اسے مجید کے گھر سے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے کیا راز تھا اور جب مجید کا راز کھلا تو ان کوارٹروں سے بیویوں نے شوہروں کی زبردستی نقل مکانی کروائی تھی۔

اب ان کوارٹروں میں سے اکثر کوارٹر کرائے پر دیئے گئے تھے۔ جن ریلوے ملازمین کو کوارٹر الاٹ نہیں ہو سکے تھے ان میں سے کچھ یہاں کرائے پر رہتے تھے، کچھ کوارٹروں میں مختلف نوکریاں کرنے والے کرایہ دار تھے۔ قدرت اللہ کے کوارٹر میں کرایہ دار کے طور پر رہنے والا بلال تھا۔

بلال ایک این جی او کے پروجیکٹ میں سروے کے سلسلے میں آیا تھا۔ اسے متوسط اور بالکل نچلے درجے کی زندگی بسر کرنے والوں کا سروے کرنا تھا، اس لئے اس نے ایسی جگہ رہنا چاہا جہاں وہ ایسے لوگوں کے قریب ہو۔ اس لئے اسے لوکوشیڈ میں جگہ ملی تو اس نے فوراً ہاں کر دی، اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔

اس صبح کی شام وہ واپس پہنچا تو پہلے اس نے اپنے لئے چائے بنائی۔ اس نے یہ سوچ کر کپڑے تبدیل نہیں کیے کہ اگلا دن اتوار کا تھا، اس لئے وہ فقط ریسٹ کریگا۔ چائے کا کپ بنا کر وہ کمرے میں آیا۔ اس نے باہر والا دروازہ کھول دیا تھا اور کمرے کے دروازے کا ایک کواڑ کھول دیا تھا۔ ان کوارٹروں میں دو کواڑوں والے دروازے تھے جن میں کڑے اور کنڈے لگے ہوئے تھے۔

ہوا کے ساتھ کڑا کھٹکنے کی آواز سے اسے لگا کہ جیسے شبانہ آگئی ہے۔ اس نے شبانہ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ نو بجے تک نہ آئی تو وہ اس کی طرف چلا جائیگا۔ کمرے میں باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے اسے تھوڑا پریشان کیا۔ اس نے دو بار دروازہ بند کیا کچھ دیر کے بعد پھر دروازہ کھول دیتا تھا۔

لمبے انتظار کے بعد آخر شبانہ اسے کھلے ہوئے کواڑ کے پاس نظر آئی۔ اس کے جسم میں گرم لہو دوڑنے لگا۔ ایک کواڑ بند اور دوسرے کے پاس شبانہ کھڑی تھی، اسے لگا کہ محل کے دروازے پر کسی اپسرا کی یاقوتی رنگ والی مورتی کھڑی ہے۔

بلال اٹھ کھڑا ہوا تو وہ ہوا کے تیز جھونکے کی طرح اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ بلال باہر والا دروازہ بند کرنے کے لئے جانے لگا تو شبانہ نے مسکراتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ بند کر کے آئی ہے۔ شبانہ کے لیے کوارٹر نیا تو نہ تھا، لیکن اسے بہت مختلف محسوس ہوا۔ باہر چھوٹے سے صحن میں رکھے گملوں میں سردی کے موسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ برآمدے کی صفائی اچھی طرح سے تھی۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں آویزاں کی ہوئی تھیں، چار کرسیاں اور ایک ٹیبل رکھا ہوا تھا اور کونے میں چھوٹے سے ٹیبل پر پانی والا نیلے رنگ کا کولر اور اس کے اوپر شیشے کا گلاس رکھا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوئی تو اندر چارپائی یا بیڈ نہ تھا۔ نیچے قالین پر فوم کے تین گدے اور ان کے اوپر رلیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں کچھ کمبل اور ایک رضائی رکھی تھی۔ دوسرے کونے میں کتابیں اور اخبارات رکھے تھے۔ دروازے کے ساتھ ایک چھوٹے ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر رکھا تھا۔ جس کے برابر میں کچھ کیسٹ بکھرے پڑے تھے۔

شبانہ اندر آئی تو بلال نے اسے بیٹھنے کا کہا۔ جب دونوں بیٹھ گئے تو کچھ دیر خاموشی رہی۔ کسی نے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اگر دیکھا بھی تو چپکے چپکے سے۔ دونوں کو یہ احساس ہوا تو دونوں نے ہی قہقہہ لگایا۔ حال احوال کی مختصر گفتگو کے بعد ان کے درمیان پھر

خاموشی چھاگئی۔

آخر بلال نے بے تکلفی اختیار کی لیکن اس میں باعزت رویہ شامل تھا۔ "اب چھوڑیں اس اجنبیت کو۔ بتائیں چائے پیئں گی یا کافی؟" بلال نے مسکراتے ہوئے پوچھا، "میں سمجھتا ہوں ذہن گرم ہوگا تو باتیں بھی شروع ہونگی۔"

"جو آپ کی مرضی۔" شبانہ نے بھی اپنائیت والے لہجے میں مختصر جواب دیا، لیکن اس کی آواز کی بازگشت پورے کمرے میں سنائی دی۔

بلال کمرے سے باہر گیا۔ شبانہ نے وہاں رکھی کچھ کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ وہ بالکل پڑھی لکھی نہیں تھی۔ کتابیں کبھی شاید زندگی میں پہلی بار ہاتھ میں لی تھیں۔ کتاب کے اوراق پلٹاتے ہوئے وہ پرسکون ہوگئی۔ اس کی ماں تلاوت کیا کرتی تھی، اس نے اسے پاک کتاب کھول کر پڑھتے سنا اور دیکھا تھا۔ اس کی ماں کہتی تھی، "بہت سکون ملتا ہے تلاوت کرنے سے، سب دکھ درد ختم ہوجاتے ہیں۔" وہ کتابیں دیکھتی رہی، کچھ کتابوں میں تصویریں بھی تھیں، جنہیں وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

یہ دوسری مرتبہ اسے اسکول نہ پڑھنے کا پچھتاوا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس کی آنکھیں اُس وقت نم ہوگئی تھیں جب اِسی گھر میں قدرت اللہ کی بیٹی نے اس سے بات کرتے ہوئے کہا تھا، "ماسٹر صاحب کہتے ہیں ان پڑھ اور ڈھور ڈنگر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔"

معمولی سی بات پر اس نے یہ طعنہ سنا تھا۔ اسے غصے سے زیادہ اس بات کی فکر ہو رہی تھی کہ آخر اسے پڑھایا کیوں نہیں گیا۔ تب وہ تیرہ برس کی تھی۔ گھر جا کر دکھی ہو کر ماں سے شکایت بھی کی تھی، تو اس کی ماں نے کہا تھا، "میں کہتی ہوں کہ مجھ سے قرآن پاک ہی پڑھ لو۔ اس سے زیادہ تمہیں اور کیا چاہیئے؟"

شبانہ نے سوچا بھی تھا کہ وہ ماں کی بات پر عمل کرے گی، لیکن وہ بھی نہ کر پائی۔ بلال

کے پاس کتابیں دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتی تو شاید اس کی زندگی کا طریقہ کار کچھ مختلف ہی ہوتا۔ اس نے آنکھوں میں امڈ آیا پانی صاف کر دیا، صاف خیالات کے صاف آنسو اس کی قمیض کی آستین نے جذب کر دیئے۔

بلال کافی کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر اندر داخل ہوا۔ شبانہ اس وقت تک کتابیں دیکھ رہی تھی۔ بلال کے چہرے پر روشنی بکھر گئی، ٹرے رکھ کر شبانہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا، "آپ پڑھنا بھی جانتی ہیں! کونسی کتابیں پسند ہیں آپ کو؟"

جب بلال بیٹھ چکا تو شبانہ نے ایک کتاب اٹھا کر کہا، "میں پڑھی لکھی نہیں۔ یہ کتاب کس طرح کی ہے؟"

"یہ ادبی اور سیاسی کتاب ہے۔ اس میں سوشلزم کے متعلق مواد شامل ہے۔" بلال نے کافی کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب یہ شوشلزم کیا ہے؟" شبانہ نے سوال کیا۔ اسے خود بھی سمجھ نہ آئی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

بلال نے مسکرا کر دیکھا، "شوشلزم نہیں یہ سوشلزم ہے۔ یہ ایک نظریہ ہے۔ یوں سمجھو کہ برابری کا نظریہ۔" سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یوں کہو نہ کہ سمسو ہے؟" شبانہ نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

"اب یہ سمسو کون ہے؟" بلال نے حیران ہو کر پوچھا۔

"سمسو جیسا جوڑا بیوی کو لے کر دیتا تھا ویسا ہی مجھے لے کر دیتا تھا۔ جو چیز خود کھاتا تھا وہ میرے لئے بھی لے کر آتا تھا۔ پکی برابری کرتا تھا۔ بالکل سوسلزم تھا۔" شبانہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کافی کا سپ بھرا۔ "اس کا پورا نام شمس الدین تھا۔ لیکن ہر کوئی اسے سمسو بلاتا تھا۔"

"آپ کا اس سے کیا تعلق تھا؟ یا ہے۔" بلال یہ پوچھتے ہوئے تھوڑا گھبرا بھی گیا۔

"ایسا ہی تعلق جیسا تم سے؟"شبانہ نے ہنس کر کہا۔

"آپ نے کبھی سوشلزم کے بارے میں سنا ہے؟"بلال نے بات کو گھماتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

شبانہ نے نفی میں سر ہلایا۔ بلال نے کچھ دیر کے لئے سوچا کے وہ اب موضوع تبدیل کر دے لیکن اس نے شبانہ کو سمجھانا چاہا۔"اور آپ نے کمیونسٹوں کے بارے میں سنا ہے؟"بلال نے شبانہ کے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

شبانہ جو کافی کا سپ بھر رہی تھی، ایکدم منہ سے کپ ہٹا کر کہنے لگی، "ہاں ہاں سنا ہے۔ اپنا اسٹیشن ماسٹر سعید احمد ہے نہ، اس کے مہمان تھے، میں کچن میں کام کر رہی تھی تو وہ ایسی باتیں کر رہے تھے، جن میں کمیونسٹوں کا ذکر تھا، اس کے ہاں اکثر ایسی باتیں ہوتی ہیں اور یونین والوں سے بھی سنا ہے۔"اس نے منہ کو صاف کیا۔ تھوڑی کافی باہر نکل آئی تھی۔ شبانہ نے اس کے قریب ہو کر رازداری سے کہا۔ "سنا ہے کمیونسٹ اللہ سائیں کو نہیں مانتے، کہیں تم بھی تو ان جیسے نہیں؟"شبانہ نے معصومانہ انداز سے کہا۔

بلال ہنس ہنس کر دہرا ہو گیا۔ شبانہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ جب ہنسنا بند کیا تو بلال نے اسے سمجھانے کے انداز سے کہا، "ایسا نہیں ہے، کمیونزم بھی ایک نظریہ ہے۔ سیاسی طور اس میں لوگوں کے بھلے کی بات ہے، سماج میں بہتری لانے کی بات ہے۔ ہم اس کے ماننے والے ہیں۔ خدا کو ماننے یا نہ ماننے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہاں سارے کمیونسٹ خدا کو مانتے ہیں۔ جو نہیں مانتے ان کو ملحد کہتے ہیں۔"

شبانہ نے کچھ پریشانی والے انداز سے کہا، "اب یہ نظریہ وظریہ کیا ہوتا ہے۔"وہ کافی ختم کر چکی تھی تو کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لفظ تو سنا ہے، لیکن یہ ہے کیا؟"

بلال کو بھی الجھن ہونے لگی۔ دل ہی دل میں سوچا کہ اس ان پڑھ عورت کے ساتھ یہ

کیا مغز ماری کر رہا ہوں۔ شبانہ کے سامنے رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر دوسری طرف رکھتے ہوئے کہا، ”یوں سمجھو کہ یہ نظریے وظریے بھی سمسو ہوتے ہیں۔" بلال اپنی ہی بات پر مسکرایا اور اس نے بھی قہقہہ لگا دیا۔

دونوں نے کافی ختم کر لی تو بلال نے ٹرے اٹھا کر دوسری طرف رکھ دی۔ دونوں کے درمیاں جو تھوڑی بہت خاموشی حائل ہوئی، اس سے اجنبیت ختم ہو چکی تھی۔ ویسے تو بلال ایک این جی او کی طرف سے سروے کے پروجیکٹ کے سلسلے میں آیا ہوا تھا، لیکن وہ ایسے سیاسی کارکنان میں سے تھا جو حقیقی معنی میں نظریاتی ہوتے ہیں۔ جب شبانہ نے باتوں باتوں میں بلال کو صرف اتنا ہی بتایا کہ سعید احمد نے اسے بھی شرابی بنا دیا تھا تو بلال کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے پاس رکھی ہوئے بوتل نکالی اور ان کی گفتگو کا دوسرا دور نئی ترنگ کے ساتھ شروع ہوا۔

بلال اسے اپنی سوچ کے بارے میں بتانے لگا، اس نے اسے سندھ کی تکلیفوں کے متعلق بتایا کہ سندھ میں رہنے والوں کا مقدر یہ نہیں کہ وہ بھوک، غربت اور ذلت آمیز زندگی بسر کریں۔ وہ انسانی برابری کا قائل تھا۔ اس کا من بھی موجی قسم کا تھا۔ وہ عملی طور پر بھی وہی تھا جو وہ کہتا تھا، بولتا تھا۔ اس کی روح میں ایک سرگرداں صوفی بھی تھا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا، اس کی بحث کا موضوع ہی یہ ہوتا تھا کہ "کسی سے بھی نفرت نہیں، دوستو" یہ اس کا نعرہ بنا ہوا تھا۔ یہی تبلیغ کرتا رہتا تھا کہ دنیا میں دھرتی کے باسیوں کو اپنی دھرتی کی پیداوار اور وسائل پر مکمل اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ سندھ کے وسائل کی لوٹ مار کے متعلق بات کرنے سے کبھی نہیں گھبرایا۔

اس کی محبت کا معیار ہی یہ تھا کہ جسے اپنی دھرتی سے محبت نہیں ہوتی تو اسے کسی بھی ہستی سے حقیقی محبت نہیں ہو سکتی۔ اس نے اس رات شبانہ سے جب ایسی باتیں شروع کیں تو وہ بھی قائل ہوتی گئی۔ "ایسے خالی جینا کیا ہے؟ صرف کھانے، پینے، گھومنے میں عمر بتانا اور مر جانا،

ایسے زندہ رہنا کسی کام کا نہیں۔ انسان کو ان سب چیزوں کے ساتھ اتنا کچھ ضرور کرنا چاہیئے کہ مرنے کے بعد کوئی نہ کوئی یاد تو کرتا رہے۔" بلال جب یہ باتیں کر رہا تھا اس وقت تک بلال تین پیگ اور شبانہ ڈیڑھ پیگ پی چکے تھے۔ "انساں کو اپنے وقت میں بھی جینا چاہیئے۔ ایسا کچھ کرنا چاہیئے جس سے معاشرہ چونک جائے۔ انساں کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔"

شبانہ کو بات زیادہ سمجھ نہیں آئی لیکن اس نے بلال سے پوچھا، "تم نے ایسا کچھ کیا ہے؟"

بلال اس کی بات سے گھبرا گیا۔ شبانہ کو اس کی باتوں میں دلچسپی بھی تھی تو کسی وقت نہیں بھی تھی۔ جب بلال کو اس نے گھبرایا ہوا دیکھا تو اس نے اسے اپنے دل کی بات کہہ دی جس کی وہ بہت زیادہ قائل تھی، "کچھ بھی کرنے کے لئے بہادری ضروری ہے، اگر ہمت نہیں تو پھر جینا بھی کیسا۔۔۔ میں تو کہتی ہوں اس سے مر جانا بہتر ہے۔" شبانہ نے لگاتار دو گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"واہ واہ۔۔!! زبردست! ایکسیلنٹ! ماروِلس! کمال کی بات!" بلال اس کی بات کی تعریف کرنے لگا اور اس کی سوئی ایسی اٹک گئی کہ دوسری کوئی بات کرنے کی بجائے تعریف کرنے پر زیادہ زور دیتا رہا۔ تعریف کرتے ہوئے اس کا نشہ بڑھتا گیا اور انگریزی میں بھی شبانہ کی تعریف کرنے لگا۔ شبانہ حواس باختگی سے اسے دیکھتی رہی۔ آخر کار چلا کر کہا، "اے نظریوں والے! پیٹ خالی ہے، کچھ کھانے کا بندوبست بھی ہے یا یہ انگریزی ہی کھلاؤ گے۔"

بلال نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا، "ابھی تو ٹائم ہے۔" کچھ سوچ کر، "او سوری! میرے ٹائم میں دیر ہے، آپ شاید جلدی کھاتی ہیں۔"

وہ اٹھا اور کھانے کا بندوبست کر لیا۔ شبانہ اس کے ساتھ پیتی کھاتی اور باتیں کرتی ہوئی وہیں سو گئی۔ جب صبح آنکھ کھلی تو بلال ابھی سویا ہوا تھا۔ لیکن وہ ذہن پر زور دینے لگی۔ رات کے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ دوسرے مردوں سے مختلف کیسے ہو سکتا

ہے۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے جگ سے پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔ اسے نیند سے پہلے والی آخری بات یاد آئی۔

"ضروری نہیں کہ مرد اور عورت گپ شپ کریں اور پھر ایک دوسرے کے جسموں کو بھی پینے لگیں۔ میرے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم دوست بن کر ایک دوسرے سے گپ شپ یا کمپنی کر رہے ہیں۔" بلال نے اسے کہا تھا۔ سونے سے پہلے قہقہہ لگا کر یہ بھی کہا، "اور خبردار! یہ اندازہ قائم نہیں کرنا کہ میری مردانگی میں کوئی مسئلہ ہے، میں اس معاملے میں بہت سیریس ہوں۔"

بلال سویا ہوا ہی تھا کہ شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی، کمرے کا دروازہ کھولا تو ٹھنڈی ہوا نے اس کے جسم میں کپکپی پیدا کر دی۔ اس نے سوچا گھر ہی جانا چاہیئے۔ بالوں پر ہاتھ پھیر کر سیدھے کیے۔ باہر دھوپ تو تھی، لیکن ٹھنڈی ہوا کے باعث خشک سردی بھی تھی۔ باہر والے دروازے کہ پاس پہنچ کر اسے اچانک خیال آیا کہ باہر لوگ کیا سوچیں گے کہ کسی دوسرے گھر سے نکلی ہوں۔

عام طور پر اس کے لئے ایسی باتوں کو ذہن میں لانا تو دور کی بات تھی لیکن سوچ کے بھی قریب نہ تھا۔ اچھائی بہتری کو پیدا کرتی ہے اور اسے اس طرح کا احساس ہونا، حال ہی میں اس کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور جب دیکھا کہ نزدیک میں کوئی ایسا نہیں جو اسے نکلتا ہوا دیکھے۔ وہ تیزی سے باہر نکلی اور ہوا کے تیز جھونکے کی طرح اپنے کوارٹر کے دروازے تک پہنچ چکی تھی کہ ایسا ہی ہوا کا جھونکا اس کے سامنے تھا، اس کے جسم سے جیسے خون ہی خشک ہو گیا۔ جیسے برفانی ہوا چلی ہو۔

سہیل نے اس وقت اس کا ہاتھ پکڑا جب وہ اپنے کوارٹر کا دروازہ کھولنے والی تھی۔ "دیکھ شبو! تم میری بات تو سنو، پھر تم جو چاہو سلوک کرو۔" سہیل نے منتیں کرتے ہوئے کہا۔ اس کی داڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اس کا رنگ سانولا ہو گیا تھا۔

شبانہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ سہیل نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ "مجھے بہت پچھتاوا

ہوا ہے۔ میری زندگی کا چین ہی چھن گیا ہے۔ تم مجھے معاف کر دو۔" سہیل کی آواز غمگین تھی۔
شبانہ کو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا اور مختلف محسوس ہوا۔

شبانہ کو اتنی سردی لگ رہی تھی کہ اس نے اس سے جان چھڑانے کے لئے کہہ دیا۔"
ٹھیک ہے، پھر کبھی!۔۔۔"

وہ زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اور ایکدم سے اندر چلی گئی۔ سہیل اسے دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں آیا کہ پیچھے چلا آئے لیکن وہ ایسا کر نہ سکا۔

☆☆☆

سہیل کے دوستوں غفار اور عرفان پر کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا لیکن سہیل کی سوچ میں تبدیلی آگئی تھی۔ اسے گھر والوں نے اسی لاپرواہیوں اور آوارگی کی وجہ سے کئی بار سزائیں دی تھیں۔ اس کے باپ نے تو کئی بار اس کی پٹائی بھی کی تھی کہ وہ کوئی روزگار شروع کرے، ان کے گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس کی ماں کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا کہ وہ سہیل کے لئے تعویذ دھاگے کروائے۔ اس کے کمزور عقیدے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک عامل نے تو اسے کہہ دیا تھا کہ تمہارے بیٹے پر جنات نے کنٹرول کر لیا ہے، جو اس سے من مانیاں کرواتا ہے، وہ خونی قاتل بھی ہو سکتا ہے۔

سہیل کی ماں نے جب سہیل سے یہ بات کی تھی، اس وقت تک اس کے دھکے سے گلزار مر چکا تھا۔ سہیل پر اس بات کا ایسا اثر ہوا کہ اسے دو دن بخار رہا۔ وہ شدید پشیمان رہنے لگا۔ اس کے جسم سے گوشت ایسے کم ہو گیا جیسے کسی ترکھان نے لکڑی کو چھیل کر پتلا کر دیا ہو۔

سہیل کو پریشانی ہونے لگی۔ وہ خود کو سمجھاتا رہا کہ اس نے گلن کو نہیں مارا۔ سب اتفاقیہ

ہوا لیکن پھر اسے یہ خیال بھی ستانے لگتا تھا کہ یہ اتفاق اسی وجہ سے ہوا کہ وہ شبانہ کے گھر گیا۔ کافی دنوں سے سوچ رکھا تھا کہ وہ شبانہ سے معافی مانگے گا۔ ایسے مواقع ڈھونڈ تا رہا اور انتظار میں تھا کہ وہ کہیں تنہا ملے۔ جب اس نے فوراً اسے معاف کیا اور گھر چلی گئی تھی تو وہ خوشی سے دوڑتا ہوا مسجد پہنچا اور سجدے میں گر گیا۔ کافی دیر تک وہ روتا اور گڑگڑاتا رہا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ شبانہ نے اسے دل سے معاف کیا ہے یا نہیں؟

لیکن شبانہ تو اس خوف سے لرز گئی تھی کہ شاید سہیل نے اسے ساتھ والے کوارٹر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اسے بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اندر آ کر اس نے پہلی بار گھر کے دونوں دروازے بند کیے تھے۔ کچھ دیر کمرے میں بیٹھنے کے بعد باہر نکل کر اس نے دوبارہ دروازے دیکھے تھے کہ کہیں کھلے تو نہیں رہ گئے۔ سہیل سے اچانک ملنے کی وجہ سے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس نے زندگی کی ایک بالکل مختلف رات گذاری تھی۔ ایک وہ سعید احمد تھا جو اس کا گوشت نوچ کر فرحت محسوس کرتا تھا ایک یہ بلال ہے جس نے اس کی روح کو سمیٹ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

سہیل نے اس کی زندگی کو بھٹہ بنا دیا تھا جس میں وہ ایسی مٹی کی مانند تھی جس سے بار بار اینٹ بنا کر جلتی ہوئی آگ میں ڈالا جا رہا تھا۔ اس کے جسم کو لذتوں کی بازار میں رسوا کرنے والا سہیل اس کے لئے گالی تھا۔ اگلے دن شام تک سہیل اس کے حواس پر چھایا رہا۔ اس دوران سہیل کی کمزوری کا بھی اسے خیال آتا رہا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اتنا گڑگڑا کیوں رہا تھا؟ غروب آفتاب کے بعد جب اس کے ذہن سے غبار ہٹا تو اسے محسوس ہوا کہ سہیل کی طلب میں فرق تھا۔ وہ اس سے کچھ اور مانگنا چاہ رہا تھا؟ لیکن کیا؟ اس کے پاس اور ہے کیا؟ یہ سوچ سوچ کر اس نے ان خیالوں کو ایسے بے خیالی کے حوالے کر دیا جیسے شام نے اپنے آپ کو رات کے حوالے کر دیا تھا۔ سرد رات باہر کی گہما گہمیوں کو اولاد کی طرح گھروں میں لے آئی تھی لیکن اس کے کمرے میں سردی کی

خاموشی کے باعث باہر سے کوئی بھی آواز آ رہی تھی تو ایسے لگ رہا تھا جیسے آواز بھی کوئی جسم رکھتی ہے۔

وہ کچی نیند میں تھی کہ باہر کسی کے کودنے کی آواز سنائی دی۔ شبانہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ رضائی سے نکلنا اس کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ اسی سوچ میں تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی، پتہ نہیں کیوں شبانہ کے ذہن میں بلال کا خیال آ گیا اور اس نے اندر سے ہی پوچھا، "کون، بلال؟"

"نہیں نہیں۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ خدا کے لئے دروازہ کھولو۔ میری بات سنو!" شبانہ آواز پر دھیان دینے کے بعد سمجھ گئی کہ یہ آواز سہیل کی ہے۔

وہ تھوڑا ڈر بھی گئی۔ ناپسندیدہ آدمی اس کے لئے ایسے تھا جیسے زہر سے بھرا پیالہ۔ اس نے چلا کر شور مچانے کے خیال کو ایکدم روک لیا۔ پاؤں نیچے رکھے، ٹھنڈے کمرے کا ٹوٹا ہوا فرش بھی ٹھنڈا تھا۔ اس کی ایک چپل چارپائی کے نیچے چلی گئی تھی۔ اس نے جھک کر باہر نکالی، سرہانے سے رکھی شال اٹھائی اور آہستہ آہستہ دروازے کی کنڈی کھولی۔ سہیل جلدی سے کمرے میں اندر آیا۔ اسے اون کی ٹوپی اور بھورے رنگ کا ایک پرانا سوئٹر پہنا ہوا تھا۔

شبانہ نے اس کے چہرے پر کمزوری دیکھ کر محسوس کیا کہ بات کچھ اور ہے۔ اس لئے اس نے ہمت باندھ کر دروازہ بند کر دیا۔ جیسے ہی آگے آئی تو اسے یاد آیا کہ اس نے باہر والا دروازہ بھی بند کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ دیوار پھلانگ کر آیا ہے۔ سہیل اس کے پاؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شبانہ نے اپنے پاؤں پر یخ ٹھنڈے ہاتھوں کو محسوس کیا اور وہ تھوڑا پیچھے ہٹ گئی، "اٹھ کر بات کرو۔" شبانہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔

سہیل اٹھ کر کھڑا ہوا۔ کمزور جوابدار کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا، " وہ اتفاق تھا میرا مقصد اسے مارنا نہیں تھا۔ میں تو تمہارے پاس آیا تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ یہاں ہو گا۔" ایک ہی

سانس میں کہہ گیا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو، میں تمہاری بات سمجھی نہیں۔" شبانہ کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ بات کی ڈور پکڑنے کی کوشش کی لیکن پکڑ نہ پائی۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

سہیل نے اپنا سر جھکا دیا۔ "تمہاری جگہ پر گلزار کو دیکھ کر، میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو اسے دھکا لگ گیا، جس کے باعث وہ۔۔ وہ۔۔ فوت ہو گیا۔" سہیل سسکنے لگا اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

شبانہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ کیا کہے؟ اس نے کیا سنا؟ وہ تو گلزار کو بھول چکی تھی۔ اسے تو یہ یاد بھی نہیں تھا۔ اس کی طرح کئی لوگوں نے بھی یہ بات بھلا دی تھی کہ شبانہ بیوہ ہے یا اس کی شادی ہوئی تھی۔

"مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو یا مجھے معاف کر دو۔" سہیل نے گڑگڑا کر کہا۔ "صرف تم مجھے معاف کر دو۔ چاہے جیل بھجوا دو یا کچھ بھی کرو، مجھے معاف کر دو۔ میں زندگی کی جانب لوٹنا چاہتا ہوں۔ ایسی زندگی جو میرے ماضی سے بالکل الگ ہو گی۔ مجھے اس وقت تک سکون نہیں ملے گا جب تک تم مجھے معاف نہیں کر دیتیں۔۔۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، قرآن کی قسم ہے، سب اتفاقیہ ہوا۔ جان بوجھ کر اسے دھکا نہیں دیا تھا۔ میں تو تم سے ملنے آیا تھا۔" اس نے سانس بھرا، "یہ بات مانتا ہوں کہ تمہارے پاس آنے کی میری نیت بری تھی۔"

شبانہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اسے اور کچھ سمجھ نہیں آیا صرف اتنا کہا، "گلزار والی بات تمہیں معاف کرتی ہوں، لیکن سہیل میری زندگی کو جو یہ روگ لگے ہیں، ان کی وجہ بھی تم ہو۔" اس نے سہیل کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کہا، "اب میں تمہیں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں کہ آئندہ میرے سامنے آنے کی کبھی کوشش مت کرنا۔ بس اب جاؤ۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔۔۔ معاف کیا۔۔۔ معاف کیا۔۔۔!" اس نے 'معاف کیا'، ایسے کہا جیسے کسی

کے ساتھ زبردستی نکاح کے لئے 'ہاں' کر رہی ہو۔

اس نے شبانہ کے پاس زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ سہیل نے ایک لمبی سانس بھری اور شبانہ کے لئے ایک طویل رات چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

بلال کو یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اتوار والے دن وہ اچانک کہاں چلی گئی۔ اس کے لئے شبانہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔ کس سے پوچھے کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟ اس کے گھر کے آگے چکر بھی لگائے، سودا سلف لینے کے بہانے سے تین بار دکان پر بھی گیا۔ بہت ہی نظریں گھمائیں تھی لیکن شبانہ نظر نہیں آئی۔

رحیم داد نے بھی اسے دو بار گھر کی طرف دیکھتے اور باہر آتے جاتے دیکھ لیا تھا۔ تیز نظر والا شخص تھا۔ آخری بار جب بلال گھر کی طرف جارہا تھا تو رحیم داد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، "کس کو تلاش کر رہے ہو نوجوان؟"

بلال ہکا بکا رہ گیا۔ "کسی کو بھی نہیں!" اس نے سہمے ہوئے انداز سے ایسے جواب دیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

میں جانتا ہوں، تم کسے تلاش کر رہے ہو؟" اس نے اسے حیران کر دیا۔ "میں تمہارا کام کر سکتا ہوں۔" رحیم داد نے تھوڑا رک کر کہا، "لیکن کام مفت نہیں ہوا کرتے۔"

بلال بات سمجھ گیا، "آپ صحیح کہہ رہے ہیں، مجھے شبانہ سے ہی ملنا ہے۔"

"اس وقت وہ سعید احمد کی طرف گئی ہوئی ہے۔ لیکن اگر جیب گرم کراؤ تو میں اسے جلدی بلا لیتا ہوں۔ آج کے دور میں کام مفت نہیں ہوا کرتے۔" اس نے رازداری سے کہا۔

رحیم داد کی بات سن کر بلال کو جیسے جھٹکا لگا۔ اسے یاد آیا کہ اس رات شبانہ نے کسی سعید احمد کا ذکر کیا تھا۔ وہ اسی سوچ میں ہی تھا کہ اس کے کانوں تک اس کی آواز پہنچی۔

"کیا ہے نا، وہ وہاں کام کرتی ہے۔ نوکری ہے اس کی وہاں۔" رحیم داد نے بات پوری کی تو بلال کو جیسے اطمینان ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

رحیم داد نے ایسی شکل بنائی جیسے شکار ہاتھ آکر نکل گیا ہو۔ آج صبح سے رحیم داد پیسوں کے چکر میں تھا اور شبانہ سے بھی کہا تھا کہ صاحب سے ایڈوانس لے، وہ اس سے لینے آئیگا، لیکن شبانہ نے کڑوے لہجے سے انکار کر دیا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ اسے کسی دوسری جگہ سے ادھار ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود دو تین سے ادھار مانگا تھا اور اسے امید کے مطابق ہی جواب ملا کہ اسے کوئی بھی ادھار نہیں دے گا۔ بلال کو دیکھ کر اسے امید پیدا ہوئی تھی۔ اسی لئے وہ باہر چکر کاٹتا رہا۔

گو کہ بلال کو رحیم داد کی بات سے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ شبانہ سعید احمد کے ہاں کام کرتی ہے، لیکن پھر بھی اسے مزا نہیں آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شبانہ اب اس کی دوست بن گئی ہے، اس سے ہی ملاقاتیں کرتا رہے گا۔

اس کی زندگی ایسے لوگوں کی طرح گذر رہی تھی جو اپنے کام سے مخلص ہوتے ہیں اور جس سے روابط ہوتے ہیں ان سے مخلصانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اچھے برے کے متعلق سیدھی رائے دیتے ہیں۔ سیاسی کارکن کے طور پر اس کی بہت عزت تھی لیکن اس زندگی کی گاڑی کو چلانا ذرا مشکل تھا، اس لئے وہ غیر سرکاری اداروں میں کام کر رہا تھا۔ دو بڑے بھائیوں کے بعد وہ تیسرے نمبر پر تھا، اس سے چھوٹا ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا، اس کے بڑے بھائی کی حیدرآباد اسٹیشن پر نوکری تھی اور وہ وہاں کلاس تھری کا ملازم تھا اور بکنگ کلرکی کرتا

تھا، دوسرا نمبر بھائی حیدرآباد کے کالج میں کیمسٹری کا لیکچرر تھا۔ پرسکون وقت گزارنے والا گھرانہ تھا، کسی بھی قسم کا کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بلال کو سرکاری نوکری سے چڑ تھی، اسے شخصی آزادی پسند تھی۔ آزاد طبع ہونے کے سبب اس نے شادی بھی نہیں کی تھی، اس کی ماں، بہنیں اور بھائی اصرار کرتے تھے کہ وہ شادی کرلے، لیکن وہ ہنس کر مذاق میں کہتا تھا، "اگر میری شادی کروائی تو میں شادی کی رات گھر سے بھاگ جاؤں گا۔"

اس بات پر اس کے گھر والے ہنستے تھے۔ اسے لڑکیوں سے بھی گیا گزرا کہتے تھے۔ اس کی غیر سرکاری تنظیموں کی دو لڑکیوں سے گہری شناسائی ہوئی تھی لیکن اس نے ان سے بھی شادی کرنے سے معذرت کرلی تھی۔ سیاسی طور جلسوں کے کام کاج اور تنظیمی کاموں میں جنون کی حد تک کام کرتا تھا، اسے کسی سے دل لگی کا موقع ہی نہیں ملا۔ عشق اور محبت کی باتوں پر دوستوں کا مذاق اڑاتا تھا اور انہیں کہتا تھا، "خواہ مخواہ میں پاگل ہوئے ہو!"

لوکوشیڈ میں اسے بھائی کے توسط سے وہ کوارٹر کرائے پر ملا تھا۔ پہلے تو اسے بھی پسند نہیں آیا لیکن جلدی میں دوسری جگہ نہ ملنے کے سبب یہیں رک گیا اور اس کے ساتھ دو دوست بھی تھے لیکن ان کا کام ہفتے میں بمشکل دو دو دن ہوتا تھا۔ اس کا پڑھی لکھی اور ان پڑھ عورتوں سے واسطہ تو پڑا تھا، لیکن کسی ایسی عورت سے اس کا واسطہ نہیں پڑا تھا، جو اعلانیہ طور پر بدنام بھی ہو اور اپنے انداز میں مختلف بھی ہو۔ جس کا چرچا، پورے محلے میں کھٹے میٹھے میوہ جیسا ہو جس کو کھانا بھی ہے اور اس کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرنا ہے۔

اس رات بلال نے شبانہ سے جو گفتگو کی تھی ایسی گفتگو کا تجربہ اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، جس میں دونوں میں سے کسی نے بھی جھوٹے من سے سچائی کے دعوے نہیں کیے تھے، نہ ہی ایک دوسرے سے اپنا ماضی چھپانے کی کوشش کی تھی۔ سیدھی اور آسان باتیں۔ شبانہ کی باتیں اور اس کی سادگی بلال کے دل کو بھا گئی تھی۔ اسے لگا کہ اس نے بغیر ملاح والی کشتی کی طرح اپنے آپ

کو لہروں کے سنگ چھوڑ دیا تھا۔ اگلے دن اس نے اپنے آپ سے بات کی، خاص طور پہ وہ اس بات پر سوچتا رہا کہ اس سے تعلق جاری رکھے یا بدنامی کی تپش سے خود کو دور رکھے۔ اس کا من ہر آدمی کے لئے ایک سا جذبہ رکھتا تھا اسی لئے اس نے شبانہ سے دوبارہ ملنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

شام ہوئی تو اس نے پھر جا کر شبانہ کے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن کوئی بھی نہیں آیا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ اسی سوچ میں تھا کہ پرلی طرف سے رحیم داد بھی آ گیا۔ بلال کو ایک خیال سوجھا اور اس نے جیب سے پچاس روپے نکالے۔ پیسوں اور شراب کی بو رحیم داد دور سے بھانپ لیتا تھا، بلال نے ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا کہ اس نے اس کے ہاتھ سے پیسے چھین لیے۔ بلال کو اس کی یہ حرکت پسند تو نہیں آئی، لیکن ضبط کرتے ہوئے رحیم داد کو کہا، "اب تو ٹھیک ہے، کام ہو جائے گا؟"

رحیم داد کے دانت نکل آئے، سلام کرتے ہوئے کہا، "ہاں صاحب کیوں نہیں ہو گا؟ ابھی اس کا کام ختم ہونے والا ہی ہو گا میں خود اسے لیکر آتا ہوں۔"

رحیم داد گرتا سنبھلتا ہوا سعید احمد کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ بلال اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ وہ جب اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اپنے کوارٹر میں چلا آیا۔

☆☆☆

سعید احمد کو شبانہ پسند بھی تھی تو ناپسند بھی۔ جن دنوں وہ اس کے پاس نہیں ہوتی تھی تو سلیمان اس کے لئے کچھ دوسرے 'شکار' بھی لاتا تھا۔ نہ صرف سلیمان لیکن اس کے لئے کچھ عورتیں رحیم یار خان، ملتان اور لاہور سے بھی آتی تھیں، تو کراچی، حیدرآباد اور نوابشاہ سے بھی، لیکن سعید احمد کے پاس کوئی بھی عورت اس کا تشدد برداشت نہیں کر سکتی تھی، ماسوا دو تین کے۔

اس کی جنونی کیفیت اس کے لئے مسائل پیدا کرتی تھی اور اس نے کئی جرمانے بھی بھرے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر اس نے شبانہ پر ہاتھ اٹھانا کم کر دیا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ شبانہ کا اپنا بھی تھا، جس نے اس کا علاج موسیقی اور ڈانس میں ڈھونڈ لیا تھا۔ سعید تشدد والی عادت بھولنے لگا تھا۔ ایسا خوشگوار تجربہ اسے اس وقت ہوا جب اس کے پاس حیدرآباد کی ایک پرانی دوست آئی تو اس نے اس پر جنون میں آکر تشدد تو نہیں کیا لیکن ناچا جنونی انداز میں تھا۔

بلال سے ملاقات کے بعد وہ ہفتہ بھر سعید احمد کے پاس تھی۔ جس دن رحیم داد بلال سے پیسے لیکر اسے لے جانے آیا تھا اس دن نوکر نے اسے دروازے سے ہی لوٹا دیا تھا۔

اس پورے ہفتے کے دوراں سعید احمد اور شبانہ کے مابین خاموشی زیادہ بولنے لگی تھی دونوں زیادہ تر چپ رہتے تھے تو اس لئے دونوں کی روزانہ پینے کی عادت بڑھتی گئی۔ سعید احمد چار یا کھینچ تان کر پانچ چھ پیگ تک آ پہنچا تھا۔ شبانہ کے لئے چوتھا گلاس اس کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا اور صبح ہوش میں آنے کے بعد ہی ایک دوسرے کو سنبھالتے تھے۔ دونوں کو وہ ہفتہ نا ختم ہونے والا لگا۔

اسے الوداع کہتے ہوئے شبانہ نے کہہ دیا، "ایسا نہیں لگ رہا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں؟"

سعید احمد نے سوچا کہ وہ اس کی بات پر ہاں کرے لیکن کچا آدمی نہیں تھا، اسے اندازہ تھا کہ اسے کسی بھی وقت شبانہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے، اس لئے اس نے جواب دیا، "میں تو نہیں ہو رہا، البتہ تمہاری مرضی ہے جو سوچو۔" سعید نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا، "اگر تم بیزار ہو رہی ہے تو صاف بات کرو۔"

شبانہ کے من کو پتہ نہیں کیا سوجھی، کہ اچانک اٹھ بیٹھی اور کہنے لگی، "ہاں میں ہو گئی ہوں۔ ایسی تنہائی کے ساتھ میرا گذارا مشکل ہے۔"

سعید احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اس کی بات سنے بنا باہر نکل آئی۔ کھلی جگہ پر لمبی لمبی سانسیں بھریں۔ درختوں کی جانب دیکھا، آسماں کو گھورا اور واپس اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اسے جیل جانے کا تجربہ تو نہیں تھا لیکن اسے لگا کہ وہ کسی جیل سے آزاد ہو رہی ہے ۔ وہ جیسے کہیں باندی تھی اور غلامی کی زنجیریں توڑ کر آئی ہو۔ ایسے سرور اور قرار کا احساس اسے شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ اسے یاد آیا کہ بلال کے ہاں گپ شپ کرتے ہوئے اس نے آزادی کے حوالے سے بات کی تھی:

"جو لوگ غلامی کا ذائقہ چکھتے ہیں، ان کی روحوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ان کو تازہ ہواؤں سے زیادہ بند اور تنگ کمروں میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ یوں سمجھو کہ قدرت کی نعمتوں سے محروم لوگ ہوتے ہیں۔" بلال نے اسے کہا، "آزادی لوگوں کو مکمل انسان بنا دیتی ہے۔ ایسی آزادی جس میں آدمی اپنا اختیار ان آزاد اداروں کو سونپ دے جو سب سے ایک جیسا برتاؤ کریں۔ ایک جیسے قوائد اور قانون نافذ ہوں۔ پھر یہ آزاد فضائیں اور انسان کائنات کو خوبصورتی بخشتے ہیں ۔ ایک دوسرے سے برابری اور عزت کرتے ہوئے جو خوشبو روحوں کو مسحور کرتی ہے، وہ ناخداؤں کے پاس ہوتی ہی نہیں۔ "

بلال کی یہ باتیں اس کے سر سے گذر گئی تھیں، لیکن اسے دکھوں اور دردوں سے آزادی والی بات کی سمجھ تو تھی کیونکہ وہ تو ان تجربات سے گذری تھی۔ اسے زندگی گذارتے ہوئے کچھ زیادہ احساس تو نہیں ہوتا تھا، لیکن جب وہ یہ باتیں من میں سمیٹنا شروع کرتی تھی تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور دکھ آپس میں ایسے ملتے تھے جیسے کڑوے رس میں ملائی ہوئی شہد۔

وہ سعید احمد کے گھر سے واپس آکر دروازہ بند کر کے سو گئی۔ اسے گھر کی

طرف آتے دیکھ کر دروازے پر آئے سائل لوٹ گئے کیونکہ اس نے کسی کے لئے بھی دروازہ نہیں کھولا۔ اس کے باپ نے آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹایا تو بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا وہ واپس جا کر لوکوشیڈ ہی کے ایک میخانے میں سو گیا۔ بلال نے بھی دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن اتنا آہستہ کھٹکھٹایا، شاید وہ آواز اندر تک پہنچی ہی نہیں ہو گی۔

شبانہ ایسی بے پرواہی کی نیند کرتے ہوئے بہت سکون محسوس کرتی تھی۔ اس کے لئے یہ نیند ایسے تھی جیسے ہوا کے ساتھ درختوں کے سوکھے پتے جھڑ جائیں۔ اگلے دن طویل نیند کے بعد جاگی تو اسے اطمینان کا احساس ہوا۔ اسے اپنا جسم بالکل ہلکا محسوس ہوا۔ بے اختیاری میں اس نے ہلکی ورزش بھی کرنا شروع کی۔ باہر نکلی تو اسے معلوم ہوا کہ دوپہر ہو چکی تھی۔ صحن میں دھوپ تھی۔ سردیوں کی دھوپ اسے ویسے بھی بہت پسند تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ باہر نکل کر دو درختوں کے درمیاں موجود دھوپ میں کھڑے ہو کر خوشی سے اچھلتی تھی تو اس کی ماں دیکھ کر کہتی تھی: " تلسی کی مانند ہوا میں جھول رہی ہو۔"

اسے تلسی کی خوشبو اچھی لگتی تھی۔ اس وقت لوکوشیڈ میں تلسی کے پودے لگے ہوئے ہوتے تھے، وہ اس کے گہرے بھورے پھول میں موجود سفید پنکھڑیاں توڑ کر کھاتی تھی۔ تلسی کے پھول اور پتے توڑ کر اپنی ہتھیلیوں پر مسل کر گھر آ کر اپنی ماں کو اپنے ہاتھ سنگھاتی تھی تو اس کی ماں ذکیہ کہتی تھی:

"میری بیٹی کے ہاتھ تو پھولوں جیسے ہیں۔" مسکراتے ہوئے اسے کہتی تھی، "شبانہ یہ پھول دو تو میں قرآن پاک کے اوراق میں رکھوں۔"

وہ بھی تالیاں بجا کر، ماں کی طرف ہاتھ بڑھا کر توتلی آواز میں کہتی تھی:

"اماں یہ لو"

ذکیہ باغ و بہار ہو جاتی تھی اور اس کے نرم ہاتھ پکڑ کر انہیں چومتی تھی۔

شبانہ کبھی تلسی کے بھورے اور سفید پھولوں کو توڑ کر کانوں کے اوپر بالوں میں سجا کر ماں کے پاس آتی تھی اور اسے کہتی تھی:

"اماں سونگھ کر دیکھو، مجھ سے تلسی کی خوشبو آ رہی ہے۔"

"ہاں تم تلسی ہی تو ہو۔" اس کی ماں ہنس کر کہتی تھی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ جب وہ بلال کے قریب بیٹھی تھی تو اس نے بھی اسے یوں کہا تھا، "مجھے تم سے تلسی کے پھولوں جیسی مہک آ رہی ہے۔"

شبانہ کے سامنے اس کی ماں کا چہرہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے بلال کا چہرہ اور مسکراہٹ یاد آئی۔ اس نے بے خودی سے ساتھ والے کوارٹر کی طرف منہ کرتے ہوئے کہہ دیا، "سوسلٹ، تلسی چاہیئے؟"

وہ خود ہی مسکرائی اور ہنس بھی دی۔ اسے اپنے آپ سے اس طرح بات کرنا ایسے لگا جیسے وہ اپنے آپ سے مل رہی ہو۔ خود سے ملنا اسے تلسی کی خوشبو کی طرح مسحور کر رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اسے خوشی کے ایسے لمحے کم ہی راس آتے ہیں۔ اس کا باپ آتے ہی اس پر سیخ پا ہو گیا اور کم و بیش اس سے لڑنے والا تھا کہ شبانہ ایکدم سے باہر چلی گئی۔ وہ اس سے اس بات پر زیادہ غصہ نہیں تھا کہ گذشتہ رات گھر کا دروازہ نہیں کھولا تھا، لیکن رحیم داد کو سلیمان نے بتا دیا تھا کہ شبانہ سعید احمد کے ہاں سے چلی آئی ہے۔ سعید احمد کو چھوڑنے کہ علاوہ رات کو اسے سخت سردی میں خواری بھی جھیلنی پڑی۔

وہ باہر نکلا تو شبانہ اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ جھاڑیوں کے درمیان راستہ عبور کر کے سامنے ریلوے بند کے پاس پہنچا، اسکا اندازہ صحیح نکلا۔ شبانہ ٹرین کی پٹریوں کے پاس ہی بیٹھی تھی اور مغرب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسے انتظار میں جو انتظار نہ تھا۔

رحیم داد نے وہاں پہنچ کر دوبارہ شبانہ پر غصے کا اظہار کیا، اس کے منہ سے جھاگ نکل

رہی تھی۔ کمزور اور ضعیف گھوڑے جیسے رحیم داد کے غصے سے شبانہ کو ایسی کراہت ہوئی کہ اسے کہا، "ابا بس کر رہے ہو یا نہیں۔ تمہیں ٹرین کے نیچے دونگی یا خود کو!"

رحیم داد اس کی غصے اور بیزاری سے نکلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ڈر گیا۔ بیٹی سے زیادہ اسے اپنے مرنے کا خوف ہوا۔ "جا رہا ہوں، پاگل ہو گئی ہو کیا!" وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

شبانہ کافی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ وہ وہاں سے گذرنے والوں کے جملوں سے بے پرواہ ہو گئی تھی۔ سورج ڈوبنے لگا تو چھاؤں بڑھ کر اس تک پہنچی اور اسے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تو وہ اپنے آپ کو بانہوں میں سمیٹ کر آہستہ آہستہ کوارٹر میں واپس آئی۔

رات کو اس نے باہر نکل کر بلال کے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ دروازہ کھلا تو سامنے ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔ اسے خیال آیا کہ واپس چلی جائے لیکن اسے ایکدم سے یاد آیا کہ بلال نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ساتھ دوسرے دوست بھی رہتے ہیں۔ اس نے بے پرواہ ہو کر اس شخص سے کہا، "بلال ہے؟"

اس شخص نے ہاں کہا تو شبانہ نے اسے بلال کو باہر بھیجنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر میں بلال باہر آیا، وہ حیران تھا۔ شبانہ نے اسے باہر آتے ہی کہا، "تمہارے پاس سامان ہے تو میرے کوارٹر میں بیٹھتے ہیں۔"

بلال سوچ میں پڑ گیا تو شبانہ نے واپس جاتے ہوئے کہا، "میں دروازہ کھلا رکھ رہی ہوں، جس وقت تمہارا دل کرے آجانا۔ میں نے تمہارے لئے کھانا بھی بنایا ہے۔"

بلال وہیں کھڑا تھا تو وہ اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ آدھے گھنٹے بعد بلال شبانہ کے پاس تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لال رنگ کی آدھی بوتل اور ایک سفید رنگ کی چوتھائی بوتل تھی۔ یہاں رہنے کے بعد بلال نے اپنی لائن بنالی تھی۔ سنتوش روہڑی سے شام کو آتا تھا اور اسے سامان دے کر چلا جاتا تھا۔ آدھے لیٹر سے وہ چھ یا سات پیگ بناتا تھا اور چوتھائی سے تین یا ساڑھے تین پیگ

بناتا تھا۔ سنتوش یہ ساماں لاتے وقت چھوٹے بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر آتا تھا۔ وہ بچے کی بیگ میں شراب لے آتا تھا۔ بلال نے اس بات پر اس سے جھگڑا بھی کیا اور اسے کہا، "دیکھو، ایسے کام کے لئے معصوم بچے کو استعمال کرنا غلط ہے اور کتابوں کے ساتھ یہ ساماں لانا بھی انتہائی ناپسندیدہ عمل ہے۔"

پہلے تو اس نے بلال سے کہا کہ ٹھیک ہے پھر تم چاہو تو نہ لو۔ لیکن جب بلال نے اسے دوبارہ سمجھاتے ہوئے کہا، "پولیس اور دوسرے سرکاری اداروں کو منتقلی بھی دیتے ہو تو پھر معصوم بچے کی تعلیم اور ٹائم کیوں خراب کر رہے ہو؟"

یہ باتیں اس کی سمجھ میں آئیں اور دوسرا اسے یہ بھی خیال ہوا کہ مستقل گاہک ہے ہاتھ سے نکل نہ جائے، اس لالچ میں اس نے بچے کو لے کر آنا بند کر دیا۔ "سامان" اخبار میں لپیٹ کر قمیض کے نیچے چھپا کر اس کے پاس آتا تھا۔ رات کو سات بجے کے بعد آرڈر کی صورت میں ایک سو روپے بلیک ریٹ لگتا تھا، اس لئے بلال نے سامان اسٹاک میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔ سنتوش کی لوکوشیڈ اور آس پاس میں لائن تھی۔ اس کے علاوہ اس کی کچھ پکی شراب پینے والوں کی بھی یہاں لائن تھی۔

بلال اور شبانہ چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ شبانہ نے اسے کھانا بھی کھلایا۔ دونوں نے خود کو قابو میں رکھا۔ بلال نے چار گلاس چڑھائے اور شبانہ نے ہلکے تین گلاس پیئے۔

شبانہ بلال کے لئے ایک عجیب لڑکی تھی۔ لیکن اب وہ عورت ہوئے جا رہی تھی۔ عمر کے ساتھ اس میں سلیقہ آ گیا تھا۔ بلال نے اس سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی زندگی کے ایسے واقعات بیان کیے جو وہ خود بھی بھلا چکا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ ان لوگوں کے دکھ بھی بیان کیے جنہوں نے اسے تکالیف میں ڈالا۔ خوشیاں دینے والوں کے واقعات بھی بیان کیے۔ جنہیں سنتے

ہوئے شبانہ بھی گم ہو جاتی تھی۔

شبانہ کے لئے یہ بھی پریشان کن بات تھی کہ بلال اس کے ساتھ اس ملاقات کے بعد بھی تین ماہ تک مختلف اوقات میں ملتا رہا۔ نوے دنوں میں انہوں نے بائیس راتیں اور سولہ دفعہ دن کی روشنی میں مل کر گپ شپ کی لیکن ایک بار بھی شبانہ کو محسوس نہ ہوا کہ بلال کو اس کے جسم کی طلب ہے۔ اگرچہ اس نے اس کے ساتھ ہر قسم کے موضاعات پر بات کی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے کمروں میں راتیں بھی ساتھ گذار چکے تھے۔ ساتھ بھی سوئے۔ ایک دوسرے کو گلے بھی لگایا لیکن دونوں ایک دوسرے کے لئے مرد تھے یا دونوں عورتیں بنی رہیں۔ بلال کے ساتھ ہوتے ہوئے شبانہ کو دو تین بار خواہش ہوئی تو بلال بڑی چالاکی سے اسے چڑا دیتا تھا اور اس کا ذہن اس کے دل کی طرح دھل جاتا تھا۔

بلال کو شبانہ میں بہت اچھی عورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے شبانہ کے اندر میں موجود عورت کو باہر لا کر اس کے جسم تک لانا چاہا۔ اس کی خواہش تھی کہ جیسے اس کی روح ہے، جیسے اس کا صاف شفاف من ہے، ویسے اس کا بدن بھی ہو۔ بلال کی یہ بھی خواہش تھی کہ اس کا جسم پرچون کی دکان والا سودا نہ رہے۔ وہ تین ماہ اسکی زندگی کے بچپن جیسے ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ان ہی تین مہینوں کے دوران شبانہ کے باپ کے گردے فیل ہو گئے۔ اس کا علاج روہڑی کی تعلقہ ہسپتال میں ہوا، سندھ کے دوسرے سینکڑوں ہسپتالوں کی طرح اس کا وہاں کیا علاج ہونا تھا۔ اور رحیم داد بھی باز آنے والا نہ تھا۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود وہ ہر طرح کا نشہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا رہا۔

اپریل کی تین تاریخ تھی، وہ ہسپتال کی پہلی منزل پر جنرل وارڈ کے ساتویں نمبر بیڈ پر پڑے ہوئے باپ کی لاش پر بیٹھی تھی۔ جو آدھا گھنٹہ پہلے مر چکا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے یا خاموشی سے آنسو بہائے، لیکن اس سے دونوں کام نہ ہوئے۔ اسے خاموشی نے گلے لگالیا تھا جو اسے بہلاتی رہی اور شاید وہ اس خاموشی کے ساتھ ہی روئی تھی۔ وہ آنسو اس کے باپ کے لئے تھے یا ماں کے لئے یا پھر اپنی یتیمی کے لئے تھے، وہ ماجرا وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔

اس نے اس چھوٹے سے کوارٹر میں بہت بڑے دکھ جھیلے تھے۔ اس صحن پر اس کے باپ کی لاش پہنچی تو اس کے آنسو نکل آئے۔ اسے لگا کہ تینوں لاشیں ایک ہی وقت وہاں رکھی ہیں۔ وہ باپ اور شوہر کی لاش چھوڑ کر ماں کی لاش پر رو رہی تھی۔ اپنی آہیں آسمانوں سے بھی اوپر پہنچانا چاہ رہی تھی۔

"توبہ کرو، توبہ کرو۔" اس نے ان جملوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ محلے والوں نے اسے اس طرح روتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا۔ سب کو حیرانی یہ تھی کہ وہ تو باپ سے نفرت والا رویہ روا رکھتی تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کی روح تک پہنچ نہ پایا کہ یہ آہ و بکا کس لئے ہے؟

وہ باپ کے مرنے کے بعد کوارٹر میں اپنے آپ کو حقیقی معنوں میں تنہا محسوس کرنے لگی۔ اس کے لئے کوئی رشتہ دار نہیں تھا، اگر تھے تو انہوں نے کبھی بھی اس سے یا پھر اس کے باپ سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ اس کے باپ کے مرنے کے بعد سنبل اسے کچھ دنوں کے لئے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ بلال نے بھی اس سے بہت ہمدردی دکھائی۔

بلال شبانہ کو اس طرح تنہا دیکھ کر پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ وہ شبانہ کو یہاں سے لے جائے اور اسے ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رکھے۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اس طرح چوٹ لگا تا رہا جیسے کوئی مزدور پتھر توڑ رہا ہو۔

میں اس کے ساتھ شادی کر سکتا ہوں؟ لیکن کیسے ممکن ہے کہ اس سے شادی کروں۔

میں تو اس کے ساتھ جسمانی تعلق رکھنے سے بھی کتراتا رہا ہوں۔ اس کے ماضی کا بوجھ اٹھانا میرے لئے آسان کام نہیں ہو گا۔ اس جیسی عورت کے لئے میرے ذہن میں یہ خیالات کیوں آ رہے ہیں؟ کہیں یہ دل کی بات تو نہیں جس پہ میرا ذہن ساتھ نہیں دے رہا۔ مجھے اس کے لئے اس حد تک نہیں سوچنا چاہیئے۔ میں تو شاید اسے اپنی جیسی ہی اہمیت دیتا رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہی کافی ہے۔

بلال اپنے سوالات کو خود ہی رد کرتا رہا، اسے اس بات کی بھی حیرانی ہوتی رہی کہ وہ شبانہ کے متعلق اس حد تک اس لئے تو نہیں سوچ رہا کہ اسے اس سے بہت ہمدردی ہے۔

☆☆☆

شبانہ کے لیئے بے گھر ہونے کا نیا مسئلہ بھی پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے پاس باپ کے مرنے والی تاریخ سے اس کوارٹر میں رہنے کے لئے صرف چھ ماہ تھے، اس کے بعد اسے کوارٹر خالی کرنا تھا۔ اس نے یہ بات بلال سے کی جس نے معلومات حاصل کر لی کہ شبانہ کو ریلوے میں نوکری بھی مل سکتی ہے کیونکہ باپ کے وارث والا کوٹا موجود تھا اور نوکری ملنے کے بعد وہ کوارٹر بھی اس کے نام ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں بلال نے یونین والوں سے بات کی، جہاں پہلے ہی کلاس فور کے کئی ملازمین شبانہ کے حامی تھے۔ تین عہدیداروں کے علاوہ دوسرے ملازمین بھی اکیلے اکیلے آ کر اس سے ملتے تھے اور اسے نوکری دلانے کے لئے اپنی اپنی کارکردگی بیان کرتے تھے۔ شبانہ کو نوکری دلانے کا اصل کام سنبل کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ سنبل نے سلیمان پر زور دیا اور اس نے سعید احمد کو اس کی مدد کرنے کے لئے منتیں کی۔ سعید نے بھی اس کے ساتھ بتائے ہوئے وقت کو یاد کرتے ہوئے حکام سے خط و کتابت کی۔ یونین کے عہدیداران کو احتجاج کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

پہلے مرحلے میں کلاس فور کے ملازمین نے ہڑتال کی دھمکی دے دی۔ معاملے نے طول نہیں پکڑا اور ریلوے کے ڈی ایس نے شبانہ کو نوکری دینے والا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

شبانہ کو انتظار گاہ میں سوئپر والی نوکری مل گئی لیکن اس کے ساتھ یونین کے کچھ لوگ ہاتھ کر گئے، اس کے باپ کے ملے ہوئے پیسوں سے اسے صرف پچپن ہزار روپے ملے۔ اس نے وہ پیسے بھی ایسے ختم کر دیئے کہ اسے پتہ ہی نہ چلا، کچھ کپڑے خریدے، کچھ گھر کا سودا سلف، باقی رات کے "سامان" میں خرچ کر دیئے۔

شبانہ کو نوکری کا آرڈر ملنے کے بعد بلال اسے اروڑ لے آیا۔ جہاں اسے کالکا دیوی کا مندر دکھایا، اس کے ساتھ پہاڑوں کی آغوش میں بیٹھ کر اسے گلے لگایا، "کاش میں تمہارے ساتھ شادی کر سکتا!"

اس نے یہ بات شبانہ سے دو تین بار کی، جس پر شبانہ نے اسے ڈانٹ دیا، کیونکہ اس نے اسی دن یہ بات دس بار کی تھی۔

''نہیں کر سکتے تو کہتے کیوں ہو؟ میں نے تو تم سے نہیں کہا۔" شبانہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہی تو دکھ ہے، میں جانتا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ تم کیوں نہیں کہتی؟ اس بات کا اور بھی زیادہ دکھ ہے۔" بلال نے اس سے یہ عجب انداز والی باتیں راجا ڈاہر والے قلعہ کی جگہ بچے ہوئے کھنڈرات کی ایک دیوار کے سائے میں کیں۔

شبانہ کے اندر کی ساری اینٹیں سرکنے لگیں۔ منجمد پتھروں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی پتھرا گئی تھیں۔

اروڑ کا چکر لگا کر آنے کے دو دن بعد اسے معلوم ہوا کہ بلال اداس اداس کیوں تھا۔ اس دن شبانہ نے اچانک دیکھا کہ قدرت اللہ کے کوارٹر کو تالا لگا ہوا ہے۔ اسے پتہ نہیں کیوں محسوس

ہوا کہ اس کی قسمت کو بھی تالا لگ گیا ہے۔ نہ صرف بلال پروجیکٹ مکمل ہونے کے بعد چلا گیا تھا بلکہ سعید احمد کا بھی تبادلہ ہو گیا تھا۔ وہ جس دن بلال کے ساتھ اروڑ گئی ہوئی تھی، اس دن سلیمان نے اسے بہت تلاش کیا۔ جب وہ بلال کے ایسے اچانک چلے جانے والی کیفیت کو اپنے ذہن کے آنگن میں بچھا کر سنبل کے پاس پہنچی تو وہاں اسے سلیمان ملا، جس نے بے چین ہو کر جلدی سے کہا، "تم کہاں تھیں؟ گھر میں نکلنا نہیں آتا کیا! میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ سعید صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ چلا گیا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا تھا۔" سلیمان ایک ہی سانس میں کہتا گیا اور وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

شبانہ سنبل سے ملے بغیر واپس آئی اور کمرے میں چلی گئی۔ اسے یاد آیا کہ بلال اس کے پاس ایک چوتھائی بوتل چھوڑ گیا تھا۔ وہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی، خیالات کی فوج اس کے ذہن پر حملہ آور تھی۔ اس نے چوتھائی بوتل کا ڈھکنا کھولا اور پانی ملائے بغیر پی گئی۔ اسے لگا کہ وہ خود کو پی رہی ہے۔

☆☆☆

میں نے اپنے ساتھ یہ کیا کر دیا ہے۔ مجھے بلال سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔ لیکن بلال کیوں! اس سے پہلے جمیل بھی تو تھا۔ لیکن اس وقت جمیل کہاں ہے؟ اس کی بیوی بھی فوت ہو گئی ہے۔ اسے میری ضرورت ہوگی۔ وہ بچوں کو کیسے سنبھال سکے گا؟ مجھ سے شادی سعید احمد بھی تو کر سکتا تھا۔ اور ہاں وہ حرامی سہیل۔۔۔ جس نے میری زندگی برباد کی۔ اس پر بھی تو میرا حق تھا۔ اور نہیں تو وہی مجھ سے شادی کرنا۔ بلال کو تلاش کرنا مسئلہ ہے، وہ اب مجھ سے شادی بھی نہیں کرے گا۔ حیدرآباد کی ہواؤں میں کسی نہ کسی کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرتا

ہو گا۔ مجھے تو سمسو جیسا کوئی دوسرا یار بھی نہیں ملا ہے۔ مجھے جمیل کی تلاش کرنی چاہیئے۔

بکھرے بھٹکے خیالات اسے صرف اس دن نہیں آئے تھے، بلال کے جانے کے بعد وہ ایسے خیالات میں یوں دھنستی گئی جیسے ریل کی بوگی میں گنجائش سے زیادہ لوگ گھس جائیں۔ شبانہ شبو ہو گئی تھی۔ کسی کو بھی اس کا پورا نام یاد نہیں تھا۔

انہی دنوں میں موبائل فون بھی ایسے عام ہو گئے تھے کہ وہ خاکروبوں سے لے کر گاڑی چلانے والوں کے پاس بھی آ گئے تھے اور کچے کا علاقہ ہو چاہے پکا ہر شخص کی تفریح بنا ہوا تھا۔ اس کے پاس بھی موبائل فون تھا اور اس کے پاس آنے والی کالز اسے بلانے کے لئے ہوتی تھیں۔

ایک دن وہ حیران ہو گئی، جب اسے بلال کی کال آئی۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکی، "میں سیمینار میں شرکت کرنے کے لئے سکھر آیا ہوا ہوں۔ کل لو کو آیا تھا تم تو نہیں ملیں لیکن تمہارا نمبر حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔" بلال نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ اس سے ملنے آئے گا۔

شبانہ بلال کی کال آنے کے بعد خوشی اور حیرت میں اس کی کچھ ہی باتیں سمجھ پائی تھی۔ حواس بحال ہوئے تو اس نے ناچنا شروع کر دیا، موبائل فون کو چوما، آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بھی چومنے لگی۔ اس نے اپنی ہستی کا جائزہ لیا، جیسے وہ اپنے آپ سے مدتوں بعد مل رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ریلوے اسٹیشن کے انتظار گاہ کی صفائی دل سے کی۔ وہ عام طور پہ وہاں کم جاتی تھی۔ لیکن اس دن اس کا دل چاہا کہ کام کر کے وقت بتائے۔ انگریزوں کے دور میں تعمیر کی گئی انتظار گاہ میں موجود سامان بھی اسی دور کا ہی تھا۔ اس نے انتظار گاہ کے کمرے میں رکھی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل میں اپنے آپ کو دیکھنا شروع کیا۔ وہ اِس بات سے بے نیاز تھی کہ وہاں ریل کے انتظار میں عورتیں اور مرد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی جسامت بھری بھری لگی۔ چہرے پر گوشت خاصا تھا۔ بالوں میں سفیدی کی چمک چھت میں لگے بلب نے ظاہر کر دی تھی۔ اس نے

آئینے میں دیکھا تو ایک عورت بیٹھی تھی، جو اس کی جیسی نظر آ رہی تھی، اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ اب عورت ہے، لڑکی نہیں رہی۔ اس کے چہرے پر مایوسی کی لہر ایسے چھا گئی جیسے فضا میں دھند بکھر گئی ہو۔ وہ وہاں سے باہر نکلی اور پیچھے اس پر تبصروں کی ٹرین پہنچ گئی اور مسافر خیالات اترنا شروع ہو گئے اور چلے بھی یوں گئے جیسے آئے بھی نہیں تھے۔

سہ پہر کے وقت سائے پھیل رہے تھے اور سورج کی روشنی نے بھی دنیا کے گولے پر کسی دوسری دھرتی کی جانب سفر تیز شروع کر دیا تھا۔ شبو تیز تیز قدم بھرتے ہوئے اپنے کوارٹر کی طرف آ رہی تھی، جو دنیا کے گولے پر اس کی کائنات تھا۔ اس کے لئے گھر بہت ناپسندیدہ تو ہو گیا تھا لیکن اسے دو چار پل کا سکون اور قرار وہیں ملتا تھا۔ اس نے دور سے دیکھا کہ اس کا سایا اس سے پہلے ہی دروازے تک پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس کے سائے کے اوپر ایک اور سایا بھی تھا؟ وہ اپنے برابر میں دیکھنے کی بجائے دونوں سائے دیکھنے لگی۔ اچانک رکی تو دوسرا سایا بھی رک گیا۔ وہ سایا اس کے سائے سے دو فٹ لمبا تھا۔ اسے وہ سایا نیا نہیں لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ آج دو ہو گئی ہے، ایک نہیں رہی۔ اس کے کان میں سرگوشی ہوئی، "مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی بڑی ہو گئی ہو اور ابھی تک تنہا رہ رہی ہو؟"

آواز پر اس نے ایکدم سے مڑ کر دیکھا، اس کی دائیں جانب بلال کھڑا تھا۔ پہلے کے مقابلے میں اس کا جسم بھرا ہوا تھا، مونچھوں میں سفید بال آ گئے تھے، اسی طرح اس کے سر کے بال بھی کالے اور سفید تھے۔ بلال اسے مختلف قسم کا مرد لگا۔ شبو نے ایک لمحے کے لئے دونوں سائے دیکھے، جن کے قد ان کی عمروں کی طرح آگے بڑھ گئے تھے۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟ زندگی بھی شام کے سائے کی طرح آگے ہی آگے ہے۔" بلال نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ بلال نے اسے مزید حیران کر دیا، جب اس نے کہا، "لگ تو بوڑھی رہی ہو لیکن انداز ابھی وہی جوانی والا ہے۔"

شبانہ اسے کوارٹر میں لے آئی۔ بلال اس کے پاس رات دیر تک بیٹھا رہا، اسے ریڈ لیبل بھی پلائی۔ جب وہ جانے لگا تو شبانہ نے اسے کہا، 'بلال میں نے سوچا تھا کہ تم ملو گے تو تم سے ایک بات کروں گی، لیکن شاید اب وہ ممکن نہیں۔"

بلال چوتھے گیئر میں تھا، جاتے وقت کہنے لگا، "اس دنیا میں کوئی بھی چیز ناممکن نہیں۔"

بلال نے شبانہ کے نہ تاثرات دیکھے اور نہ ہی اس کی کوئی بات سنی وہ وہاں سے نکل کر کار کے پاس پہنچا اور ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ جاتے جاتے شبانہ نے اس کا یہ جملہ سنا، "دو چار دن ہوں، پھر ملیں گے۔"

☆☆☆

بلال کا انتظار جمیل کی یادوں کے اوپر سائے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس رات بلال کے جانے کے بعد اسے اداسی ہونے لگی۔ بلال پھر ملنے کا کہہ کر گیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں اسے جمیل کے خیالات ستانے لگے۔

یہ فیصلہ اس نے اس وقت کیا جب وہ شام کو ریل کی پٹری کے پاس بیٹھی تھی۔ عام طور پر وہ وہاں قریباً آدھے گھنٹے تک رہتی تھی۔ کبھی کبھی زیادہ ٹائم بیٹھتی تھی لیکن اس دن وہاں بیٹھے اسے دو گھنٹے گذر گئے۔

میں بلال سے کبھی نہیں ملوں گی۔ وہ کچھ برس پہلے اجنبیوں کی طرح آیا تھا اور چلا گیا۔ کیسا روگ تھا جو مشکل سے سنبھالا تھا۔ اب بھی آیا ہے اور چلا جائیگا۔ اس سے تو میری اب کوئی ہمسری نہیں۔ سوسائٹ ہے یا تو میرست، جو بھی ہے اس کی اپنی دنیا ہے۔ جمیل۔۔۔ ہاں جمیل بھی تو پردیسیوں اور اجنبیوں کی طرح آتا رہا ہے۔ لیکن اس کا خیال اجنبی نہیں لگتا۔ اس کی ہستی مجھے

اپنی سی لگتی ہے اور گھاس کی طرح روندی ہوئی میری ہستی بھی تو اس کی ہے۔ وہ میری روح کے راستوں پر بھی چلا ہے۔ دوسروں نے تو میرے جسم کے راستے روند کر لذتوں کی منزل پائی ہے۔ جمیل پیار کی پہلی سانس ہے۔ وہ بھی تو دوسرے مردوں کی طرح میرے پاس آیا تھا۔ نہیں شاید نہیں، اس کا آنا صرف خاص مقصد کے لئے نہیں تھا۔ وہ تو مجھ سے ملنے آیا تھا، مجھے پانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن ہوا تو وہی نا، ایسا کیوں ہے ؟ میں خود ہی اس کی وکالت کیوں کرتی ہوں ؟ فرق کیوں کرتی ہوں اس میں اور دوسروں میں۔ اماں بھی تو ٹھیک کہتی تھی نہ، جو کسی کو سچے دل اور صاف نیت سے یاد کرتا ہے وہ شخص بار بار یاد آتا ہے۔ شاید جمیل بھی تو مجھے یاد آتا ہے۔۔۔ لیکن سہیل اور سعید جیسے بھی تو یاد آتے ہیں۔۔۔ کمینے انسان!

وہ الجھ گئی، اسے سمجھ نہیں آیا کہ جمیل اس کا پیار ہے یا فقط ایک خیال۔ اس نے اسے صحرا میں، بھٹکا دیا ہے یا بے قصور ہے اور اس کی زندگی میں اجڑے ہوئے راستے دوسروں نے بنائے ہیں۔ اس نے اٹھتے وقت فیصلہ کیا کہ وہ اب بلال سے کبھی نہیں ملے گی۔ یہ اس نے کیوں طے کیا، وہ بات تو اسے بھی سمجھ نہیں آئی۔

تیسرے دن بلال اس کے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ اسے دھیرے دھیرے لہجے میں پکار رہا تھا، "شبانہ شبانہ! دروازہ کھولیں۔"

وہاں سے گذرنے والے دو تین اٹھارہ انیس برس کے نوجوانوں کے لئے یہ نام نیا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا، شبو اور شی کے نام کے علاوہ اس گھر کے باہر کسی کو بھی پکارا نہیں گیا تھا۔ بلال نے آخری دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا تو اچانک دروازہ کھلا، ایک درمیانی عمر کا شخص بلال کے سامنے کھڑا تھا، بلال چونک گیا۔

"ابھی میرا ٹائم ختم نہیں ہوا اور حرامزادی شبو ابھی تک نہیں آئی، بوتل ہی حرام ہو گئی۔" اس نے غصے سے بلال کو کہا۔

بلال کی زباں جیسے چوبیس گھنٹے تک فریزر میں رکھے ہوئے گوشت کا ٹکڑا ہو گئی۔ بلال سامنے کھڑے ہوئے شخص کو کوئی بھی جواب نہیں دے سکا۔ اس کی آنکھیں کیلوں کی طرح اس شخص کو چبھی تھیں۔ وہ شخص دروازہ زور سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ لیکن بلال حیرت سے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ "میرے لئے یہ دروازہ بند ہی بہتر ہے۔" وہ دبے ہونٹ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے واپس ہو لیا۔

اس دن کے بعد بلال کبھی لوکو شیڈ میں نہیں آیا۔

اس وقت شبانہ اسٹیشن کے انتظار گاہ کے سامنے چوڑی دیوار پر بیٹھی تھی۔ انتظار گاہ اسٹیشن سے کافی اوپر تھا۔ اس کی نظر کے سامنے اسٹیشن پر ہونے والی ساری حرکت تھی۔ لیکن اس کے خیالات جیسے فریزر میں رکھے ہوئے تھے اور وہ جیسے اروڑ کا کوئی پتھر ہو۔

☆☆☆

شبو ریلوے کے کلاس فور کے ملازمین کی محبوبہ بنی ہوئی تھی۔ لوکو شیڈ میں منتقل ہوئے اور قبضہ کر کے گھر بنا کر رہنے والوں سے لے کر نیو یارڈ کالونی تک رہنے والوں میں کئی اس کے شیدائی تھے۔ اس کی عمر کے نیم کے درخت سے پتے جھڑتے گئے۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ مردوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ مرد ہوتی تھی اور عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے آپ کو غیر موجود محسوس کرتی تھی۔

سال کا تینتالیسواں ہفتہ تھا اور اس کی عمر کا بھی تینتالیسواں سال تھا جب اسے نوکری سے نکالا گیا، اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ وہ کم سے کم سو ہفتے یعنی کہ قریباً دو سال نوکری سے غیر حاضر رہی، لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی عمر گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی جوانی بھی مستقل طور پر غیر

حاضر ہوگئی تھی۔ اب اس کی زندگی کا یہ حصہ انگریزوں کے دور میں بنائے گئے ناچ گھر کی طرح ویران ہوگیا تھا۔ اگر کوئی وہاں آتا بھی تھا تو گھڑی بھر کا مہمان ہوتا تھا اور چھاؤں جیسا احساس حاصل کرکے چلا جاتا تھا۔

اس دوران دو مرتبہ وہ بے سبب ریل میں سوار ہوگئی تھی۔ پڈعیدن کے اسٹیشن پر اتر کر آفیسوں میں جھانکا تھا۔ ریلوے کے تین ملازمین اسے دیکھتے کترا کر چھپ گئے تھے لیکن شبانہ کی نظریں جمیل کو تلاش کرتی رہیں۔ اسے جمیل کے علاوہ کسی کی بھی تلاش نہیں تھی۔

کسی نے مذاق میں اسے کہہ دیا تھا کہ جمیل میرپورخاص میں ہے تو وہ ریل میں سوار ہوگئی اور حیدرآباد تک آ پہنچی۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ویگن میں سوار ہوکر میرپورخاص روانہ ہوجائے تو اسٹیشن پر اسے کانٹے والا فخرالدین مل گیا، جو اس کے پاس روہڑی میں بھی آتا جاتا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر چھپا نہیں لیکن اسے اپنے ساتھ ایک کھولی نما کوارٹر میں لے آیا، جہاں اسے کھانا کھلایا۔ فخرالدین بہت خوش ہوا اور اسے اپنے پاس ہفتہ بھر رکنے کا کہا۔ شبو کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ جس کی تلاش میں نکلی تھی اس کی سانس وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے فخرالدین کو صاف کہہ دیا کہ وہ جمیل کے لئے آئی ہے اور اسے میرپورخاص جانا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر وہ بہت ہنسا۔ "تم تو بالکل پاگل ہو، میرپورخاص میں کدھر ہے، اس کی پوسٹنگ پنجاب میں ہے۔" شبانہ کو سوچ میں ڈوبا دیکھا تو اس کے کندھے پر تھپکی لگا کر کہا، "اور سنو شبو، اب وہ اسٹیشن ماسٹر بن گیا ہے۔ تمہارے اور ہمارے کلاس سے اوپر ہے۔ بول سے بیر مانگ رہی ہو۔"

فخرالدین اپنی نظر سے اس کے جسم کا جائزہ لینے لگا اس کی آنکھوں کی بات پڑھنا شبانہ کے لئے آسان تھا۔ وہ ایکدم جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ فخرالدین نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا، "ناراض نہ ہو، سچ سچ ہوتا ہے۔"

"تم سمجھ رہے ہو میں بدصورت ہوں، اب کسی کام کی نہیں ہوں۔" اس کی آنکھوں میں

آنسو بھر آئے۔ "فخرو کچھ بھی ہو، میں لو کو پر آج بھی راج کر رہی ہوں۔ سمجھے !اور میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں نے اپنی مرضی سے اپنا راستہ منتخب کیا ہے۔" کوئی خیال آنے پر وہ بیٹھ گئی اور سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ اپنے منہ بڑبڑانے لگی۔ "نہیں میں نے یہ راستہ نہیں چنا۔ کسی نے دھکا دیا تھا مجھے۔ شاید دھکا دینے والا راستہ ہی تھا جس پر میں چل رہی تھی۔ جسے کے ساتھ بڑے بڑے درخت ہیں۔" اچانک وہ خاموش ہو گئی۔

فخر الدین گھبرا گیا۔ اسے لگا کہ شاید شبو پاگل ہو گئی ہے۔ اس کے خیالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس نے سوچا کہ شبو کو دو چار راتیں روکے گا۔ اس نے اسے ٹھہرانے کا بندوبست بھی کر دیا تھا لیکن شبو کی ایسی حالت دیکھنے کے بعد اس نے اسے روہڑی جانے والی ایک ٹرین میں بٹھا کر واپس بھیج دیا۔ شبو کو بھی سمجھ آگئی کہ فخر الدین اسے پاگل اور کل سے اتری ہوئی سمجھ رہا ہے۔ اس بات پر وہ واپسی میں ریل کے اندر ہنستی ہوئی آئی۔

ریل کی بوگی میں کبھی انتہائی سنجیدہ تو کبھی مسکرا رہی تھی اور کسی لمحے اس کا قہقہہ نکل رہا تھا۔ بوگی میں سامنے بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کو بھی شک ہو رہا تھا کہ شاید وہ پاگل ہے۔ کیوں کہ اس کی آنکھیں بھی ان کی طرف اٹھ رہی تھیں اور اس دوران وہ ہنستی بھی رہی اور خاموش بھی ہوتی رہی۔

جب وہ حیدرآباد سے واپس ہوئی تھی تو اس کے بعد وہ کبھی بھی اپنے کوارٹر کے علاوہ کہیں بھی نہیں گئی تھی، ماسوا سامنے والی ریلوے پٹڑی کے اس نے کسی دوسری طرف بھی جانا بند کر دیا تھا۔ اس کی جوانی کی طرح اس کی نوکری بھی چلی گئی۔ اس پر اتنا ترس کیا گیا کہ اس سے کوارٹر خالی نہیں کرایا گیا۔ اس نے باہر جانا بند کیا تو اس کے ہاں گارڈوں کی حاضریاں بڑھ گئیں جو اکثر دوسرے شہروں کے تھے۔ وہی اس کا کوارٹر خالی کروانے کے مخالف تھے۔

☆☆☆

کسی نے کہا بھی نہیں تھا، لیکن اس نے سنا تھا کہ جمیل کا تبادلہ روہڑی اسٹیشن پر ہوا ہے۔ اس دن اس نے بہت بناؤ سنگھار کیا۔ باہر نکلی تو کسی نے بھی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کوارٹر کی طرف دھکیلنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کے لئے کسی نے سیٹی بجائی اور نہ ہی اس نے فقرے سنے۔

بڑے عرصے بعد شبو اسٹیشن کی طرف جارہی تھی اور اسے یاد آیا کہ اس کا نام شبانہ ہے۔ شبانہ آج جمیل سے ملنے کے لئے جارہی تھی۔ اس نے اپنی کلائی میں ہاتھ کا پنجہ محسوس کیا۔ وہ سب دن اور راتیں اس کی آنکھوں کی چھوٹی سی پتلیوں میں تھے جو اس نے جمیل کے ساتھ بتائے تھے۔ شبانہ کو اس کی یاد سے۔ ملے دھلائے سارے لمحے یاد آرہے تھے۔ اس کے قریب سے ریل گذر گئی اور بڑے عرصے کے بعد اسے اپنے بدن کا شور سنائی دیا۔ فضا آزاد بھی تھی اور صاف ستھری بھی۔

وہ اسٹیشن پر پہنچ کر پلیٹ فارم نمبر تین پر آئی۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ لاہور سے ٹرین آئی تھی۔ کراچی اور حیدرآباد جانے کے لئے مسافروں کی بھاگ دوڑ تھی۔ اوپر سے کراچی سے آنے والی ٹرین بھی پہنچ گئی۔ جتنا رش بڑھتا گیا اتنی ہی آوازیں اور شور بھی بڑھ گیا تو اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم بھی بڑھ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کا آفس اس سے دو آفیسوں کی دوری پر تھا۔ وہ رک گئی۔

جمیل مجھے دیکھ کر خوش ہوگا۔ میرا دل کیسا دھلا ہوا ہے۔ وہ مجھے کبھی کبھی طعنے دیتا تھا کہ میں گدلی ہوں۔ ہفتوں نہاتی بھی نہیں۔ وہ کتنا اچھا دن تھا جب تیز بارش میں میں نیم کے درخت کے نیچے کھڑی تھی تو اس نے پھر مجھے طعنہ دیکر کہا تھا کہ شکر ہے بارش ہوئی کہ تم نے نہا لیا۔ وہی دن تھے جب وہ مجھے اچھا بھی لگتا تھا اور نہیں بھی۔ اس پر غصہ بھی آتا تھا اور پیار بھی۔ میں نے اسے کہا تھا، "نیم کے پیڑ پر بارش ہوتے دیکھا کرو، تمہیں معلوم ہوگا کہ دل کیسے دھلتا

ہے۔"

نہ اسے بات سمجھ آئی تھی نہ ہی مجھے۔ میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ دل کے دھلنے کی اہمیت سمجھ میں آگئی۔ محبتوں کی برسات صرف دل ہی نہیں روح کو بھی دھو دیتی ہے۔ جمیل بھی اب نیم کے گھنے درخت جیسا ہو گیا ہو گا۔ اس کی باتیں بھی نمبولیوں کی طرح کڑوی بھی ہونگی اور میٹھی بھی۔

شبانہ کو سندھ کے ریلوے اسٹیشنوں پہ اور ان کے قرب و جوار میں نیم کے درخت بہت اچھے لگتے تھے۔ دو تین بار وہ میر پور ماتھیلو یا رک اسٹیشن تک ریل میں اس لئے چڑھ جاتی تھی کہ وہ وہاں سے نمبولیاں چن کر آئے گی۔ میٹھی نمبولیوں کا رس چوستی تھی۔ سوکھی نمبولیاں اکٹھے کر کے گھر لے آتی تھی۔ کبھی اس کی ماں ذکیہ نمبولیوں کو کوٹ کر تیل میں ملا کر شبانہ کے بالوں میں لگاتی تھی۔ اسے یہ بھی کہتی تھی، "شبانہ تمہاری طبیعت بھی نمبولیوں کی طرح میٹھی بھی ہے تو کڑوی بھی۔ لیکن ہنستی ایسے رہتی ہو جیسے ہوا میں نیم کے پتے لہراتے ہوں۔"

وہاں کھڑے ہوئے اس کے خیالوں میں ماں کا روشن چہرہ نمودار ہوا۔ اسے لگا کہ اس کی ماں ابھی ریل کی پٹریاں لے کر اس کے لئے نمبولیاں چننے جا رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔

"تم یہاں بیٹھی ہو، خیر تو ہے؟" شبانہ نے مڑ کر دیکھا سلیمان حیرانی سے پوچھ رہا تھا۔" شبو کہاں ہو؟ گھر آنا ہی چھوڑ دیا ہے؟"

شبانہ سلیمان کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اب وہ مرد لگ رہا تھا۔ اس کا جسم بھرا ہوا تھا۔ بڑی مونچھیں اور ہلکی داڑھی، لیکن نہ بدلی تھیں تو اس کی یہ آنکھیں جن میں شبانہ کو اب بھی لالچ نظر آ رہی تھی۔ سلیمان آہستگی سے اس کے کان میں کہنے لگا، صاحب سے ملواؤں تمہاری نوکری بحال کروانے میں مدد کر سکتا ہے۔"

شبانہ کو نہ نوکری کا خیال تھا نہ ہی وہ کسی دوسری بات کی طرف سوچ رہی تھی۔ اس نے سلیمان کو کوئی بھی جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر خالی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کے کانوں میں دوبارہ آواز آئی، "دیکھ شبو! صاحب اب بہت بدل گیا ہے۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں چھ ماہ رہ گئے ہیں، بالکل بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہاں اس کا تبادلہ ہوئے بمشکل ہفتہ ہوا ہے۔" شبانہ نے ایک بار پھر سلیمان کی طرف دیکھا۔ سلیمان اسے سمجھا رہا تھا۔

لوگوں کے رش کے باعث اس نے شبانہ کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے ایک آفس کی دیوار کے ساتھ روک کر کہا، "اس میں اب نہ وہ غرور ہے نہ طاقت۔ میں اس کے لئے کام والی عورت تلاش کر رہا تھا۔" سلیمان نے شبانہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، "شبو تم بھی اب ڈوبتے سورج کے سمے میں ہو، اچھا ہے انکار مت کرو۔"

شبانہ نے سلیمان کی آنکھوں میں دیکھا، آس پاس نگاہ ڈالی، "لوگ مرے ہوئے گوشت کو بھی نہیں بخشتے، تم میری فکر مت کرو۔" اس نے اتنا آہستہ کہا کہ لوگوں کے شور میں سلیمان سن ہی نہ پایا۔

"سعید احمد تمہیں جانتا ہے، وہ تمہیں دیکھ کر خوش ہو گا۔" سلیمان نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شبانہ نے حیرت سے سلیمان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو سوال تھا وہ سلیمان سمجھ نہ پایا نہ ہی یہ سمجھ پایا کہ شبانہ کو حاصل سے لاحاصل مل چکا تھا۔

"تم فکر مت کرو اس میں اب لڑنے جھگڑنے کی عادت بالکل بھی نہیں رہی۔ سمجھو کہ بالکل خصی سانڈھ ہے۔" سلیمان نے اسے آنکھ مارتے ہوئے شرارتی انداز سے کہا۔

شبانہ کے لئے سارے شور اور تمام آوازیں نیلے آسمان کی طرح بن گئی تھیں۔ وہ سلیمان کو وہاں چھوڑ کر، آہستہ آہستہ قدم بھرتی نیویارڈ کالونی سے ہوتی لوکو شیڈ کو پیچھے چھوڑ کر، ریل کی

پٹری کے ساتھ اس طرف آگے بڑھتی گئی جس طرف اس کی ماں ذکیہ گئی تھی۔اس کی کلائی سے جمیل کے ہاتھ کا پنجہ ٹوٹ گیا اور ریل کی پٹریاں اس کی انگلی تھام چکی تھیں اور آتی ہوئی ریل کی آواز اس کا آدھا نام "شبو، شبو" نہیں پکار رہی تھی۔اسے اچھی طرح سنائی دے رہا تھا، ٹرین کی آواز شبب۔۔شب۔۔شبا۔۔نہ نہ۔۔شبانہ۔۔۔شبانہ! پکار رہی تھی۔
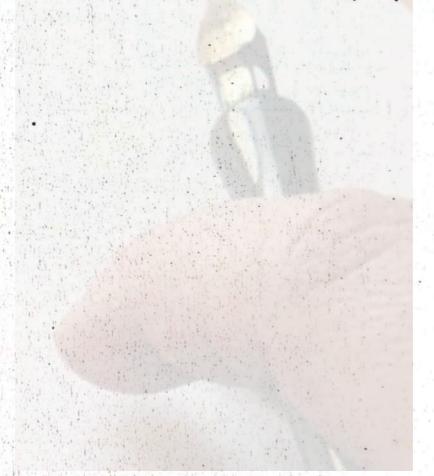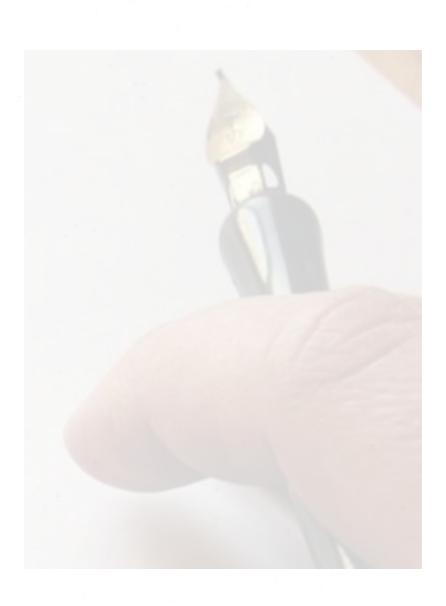
ممتاز بخاری کا یہ ناول " کلاس فور کی محبوبہ " حقیقی زندگی کی ایک ناقابلِ فراموش تصویر ہے۔ ہیمنگوے کا خیال ہے کہ ادیب کو چیزوں کو پوری سچائی سے ایسے دکھانا چاہیے جس طرح اُس نے اُنہیں دیکھا ہے اور، کچھ بھی چھپانا نہیں چاہیے بلکہ اپنے قاری کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ وہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہوا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے قاری اُن چیزوں کے دِل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔
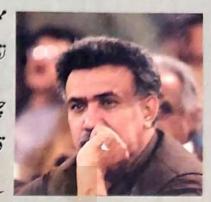
ممتاز بخاری کا یہ ناول ہیمنگوے کے قول کے معیار پر پورا اُترتا ہے۔ ممتاز بخاری نے پوری سچائی بیان کی ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ ممتاز بخاری فطری طور پر ایک حقیقت نگار ہے۔ اپنے اس ناول میں اُس نے معاشرے کی ستم ظریفی کے بارے میں صرف بتایا ہی نہیں بلکہ اُسے دکھایا بھی ہے۔ ناول کی کہانی کی بُنت میں ممتاز بخاری کی فنی قدرت کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ ناول کی کہانی متاثر کن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ ناول اپنے آپ کو پڑھوانے کی قدرت رکھتا ہے اور قاری کو اپنے جذبات و احساسات کے حصار میں لے لیتا ہے۔

ناول " کلاس فور کی محبوبہ " ریلوے مزدوروں کی زندگی کے گرد گھومتا ہے مگر ریلوے مزدور رحیم داد اور اُس کی بیٹی شبانہ اس ناول میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن دونوں کی کہانی کئی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ شبانہ کی قسمت کی لکیر پتھر پر لکیر جیسی ہو چکی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں رات گئے ٹوٹے ہوئے خوابوں سے کھچا کھچ بھری ٹرین ہر روز گزرتی ہے۔ شبانہ کی زندگی بھی ایک ریلوے سٹیشن کی طرح ہے جہاں مسافر آتے ہیں اور پھر نئی ٹرین پکڑ کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔

ممتاز نے غربت کی لکیر پر بسنے والے ایک چھوٹے سے خاندان کی نڈھال زندگی کو کمال فنی مہارت سے قلمبند کیا ہے۔ شبانہ کی زندگی ایک دردناک چیخ ہے مگر معاشرے کو سُنائی نہیں دے رہی یا پھر اُنہوں نے اُسے سُننے سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ممتاز بخاری کے ناول " کلاس فور کی محبوبہ " کا اُردو ترجمہ اُردو ادب کے قارئین میں بھی مقبولیت کا درجہ حاصل کر لے گا۔

مظہر الاسلام